اور وہ لڑکی بک گئی
مرزا محمد زمان آزردہ

# اور وہ ٹاپ گر گئی...

از
مرزا محمد زمان آزردہ
شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر

باراول . . . . . . . . . دسمبر ۱۹۷۵ء

تعداد . . . . . . . . ایک ہزار

مصنّف . . . . . . . . مرزا محمد زمان آزردہ

سرورق . . . . . . . . سیجود سیلانی

کتابت . . . . . . . . محمد حسن وفائی اندرواری

مطبع . . . . . . . . سپر پرنٹنگ پریس گاؤکدل سرینگر

قیمت . . . . . . . . پانچ روپے

ناشر

مرزا پبلکیشنز حسن آباد۔ رعناواری سرینگر ۳۔ کشمیر

ملنے کا پتہ

شیخ محمد عثمان اینڈ سنز بک سیلرز۔ فتحکدل

سرینگر۔ کشمیر

# انتساب

ان سایوں کے نام جن میں کوئی اپنا نہ نکلا

# فہرستِ مضامین

# ادبی کتب

| | | | روپے |
|---|---|---|---|
| ۱- | اردو کتاب کی تاریخ | پروفیسر عبدالقادر سروری | 12-00 |
| ۲- | تاریخ اردو ادب | رام بابو سکسینہ | 15-00 |
| ۳- | نئی حسیت اور عصری اردو شاعری | ڈاکٹر حامدی کاشمیری | 12-00 |
| ۴- | غبار خیال | مرزا محمد زمان آزردہ | 3-00 |
| ۵- | شیریں کے خطوط | " | 7-80 |
| ۶- | تعلیمی نفسیات | الف گیری | 4-75 |
| ۷- | ابتدائی سکول میں تعلیم کے طریقے | ادبی-ایچ دارنر | 4-75 |
| ۸- | سیرت اقبال | مولوی محمد طارق فاروقی | 15-00 |
| ۹- | تصورات اقبال | صلاح الدین احمد | 17-00 |
| ۱۰- | پیام اقبال | عبدالرحمٰن طارق | 10-00 |
| ۱۱- | اقبال | ڈاکٹر شکیل الرحمٰن | 3-00 |
| ۱۲- | تنقیدی نقوش | ڈاکٹر عبدالقیوم | 7-00 |
| ۱۳- | صلیبیں میرے دل کے دریچے میں | فیض احمد فیض | 20-00 |

# ناول و افسانے

| | | | |
|---|---|---|---|
| ۱- | چراغ کا اندھیرا | شبنم قیوم | 4-00 |
| ۲- | ایک زخم اور سہی | " | 4-00 |
| ۳- | آخری تمنا | مشتاق احمد ہمدانی | 4-00 |
| ۴- | وہم | رضیہ بٹ | 10-00 |
| ۵- | کنیزہ | نسیم حجازی | 10-00 |
| ۶- | جیل کے سو دن | عبدالرشید | 4-50 |
| ۷- | اور ہ ٹاپ گرگئی | ... | 5-00 |
| ۸- | عہد ساز لڑکیاں | محمود ہاشمی | 4-00 |
| ۹- | عظیم جہادی | نسیم حجازی | 10-00 |
| ۱۰- | صلیبی جہاد | صادق حسین سردھنوی | 12-00 |

# عرضِ ناشر

برادرِ مکرم جناب مرزا محمد زمان آزردہؔ کی کہانیوں کا مجموعہ "اوردہ ٹاپ کر گئی" ہدیۂ ناظرین ہے۔

اس مجموعے کا حجم بہت ہی کم ہے۔ مگر مرزا پبلکیشنز کے ہدیۂ اول کے طور پر اسے پیش کرتے ہوئے میں خوشی محسوس کر رہا ہوں۔

میں محمد اشرف مالک سیمرز پرنٹنگ پریس گاؤ کدل کا شکر گذار ہوں۔ جنہوں نے اس مجموعے کی طباعت میں غیر معمولی سرگرمی دکھائی۔

مکرمی سجود سیلانی کا شکریہ ادا نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ جنہوں نے ان کہانیوں کے مصنف کے دوست کی حیثیت سے اس کے ٹائیٹل کا ڈیزائن بنانے کی زحمت گوارا کر کے میری معاونت کی۔

جناب مرزا امیر علی جونپوری مالک اردو پبلشرز لکھنؤ کا بھی میں شکر گذار ہوں۔ جنہوں نے اس ڈیزائن کے بلاک لکھنؤ سے بنا کے بھجوا دئے۔

آخر میں اتنا عرض کرونگا۔ کہ مصنف اگر میرے برادرِ مکرم نہ ہوتے۔ تو ان کہانیوں کی خاموش گری، دھیمی آنچ، مسائل کی نوعیت، واقعات کی گوناگونی، سماج کی آنکھ اور فرد کی نظر کے متعلق ضرور کچھ عرض کرتا۔

اس کی طباعت میں جو خامیاں آپ کو نظر آئیں گی۔ وہ مصنف کی پسند ہیں کیونکہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں۔ کہ ہمیں طباعت کے کام کو یہاں کشمیر میں فروغ دینا چاہیے۔ خامیاں رفتہ رفتہ خود ہی دور ہو جائیں گی۔

نیاز مند۔ جی۔ ایم مرزا
مالک مرزا پبلکیشنز۔ احسن آباد۔ سرینگر

# ایک رائے

مرزا محمد زمان آزردہ ریاست جموں و کشمیر کے ایک اُبھرتے ہوئے انشائیہ نگار اور کہانی نویس ہیں - انشائیوں کے دو مجموعے شایع ہوئے ہیں - یہ انشائیے پسند کئے گئے ہیں - بہت کم لوگوں کو اس بات کی خبر ہو گی - کہ مرزا محمد زمان کی دلچسپی افسانے کے فن سے بھی ہے - آج وہ اپنے افسانوں کا پہلا مجموعہ شایع کر رہے ہیں - اور مجھے توقع ہے - کہ ان کے افسانے اسی شوق کے ساتھ پڑھے جائیں گے جس شوق سے ان کے انشائیے پڑھے گئے ہیں -

مرزا محمد زمان کے افسانوں میں انشائیہ نگار کا ذہن آنکھ مچولی کھیلتا ہے اور افسانوی اسلوب میں رنگ آمیزی کرتا ہے - جن لوگوں نے ان کے انشائیوں کا مطالعہ کیا ہے - وہ اس ذہن کی شوخی اور ان کے طنزیہ انداز اور معمولی باتوں میں نکتہ آفرینی کے رجحان کو بخوبی پہچان لیں گے -

مرزا محمد زمان کے انداز بیان میں ایک خصوصیت پیدا ہو رہی ہے جو توجہ چاہتی ہے - وہ ایک نکتے سے ذہن کو ایک ساتھ کئی حقیقتوں کی طرف لیجانے کی صلاحیت کو اُبھار رہے ہیں - اور یہ ان کے ایک ایسے بنیادی رجحان کا اشارہ ہے جو تخلیق کے عمل کو تیز سے تیز تر کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے - ان کے کردار اسی معاشرے کے کردار ہیں اور ان کا ماحول جانا پہچانا ہے - لیکن وہ صرف کردار اور معاشرے کو پیش کر دینا کہانی کا مقصد نہیں سمجھتے وہ معاشرے میں کرداروں کے عمل سے جو تاثرات اُبھارتے ہیں - وہ توجہ طلب بن جاتے ہیں -

سرینگر ۲۷/۱۲/۷۵

(ڈاکٹر) شکیل الرحمٰن
صدر شعبہ اردو کشمیر یونیورسٹی

# ایک رائے

محمد زمان آزردہ کشمیر کی نئی نسل سے تعلق رکھنے والے ادیبوں میں اپنی پیہم ریاضت اور ادبی سوجھ بوجھ سے اپنے وجود کا احساس دلا چکے ہیں۔ انھوں نے انشائیوں کے دو مجموعے پہلے ہی شایع کئے ہیں۔ اور اب اُن کے افسانوں کا مجموعہ منظرِ عام پر آرہا ہے۔ ادھر ان کے چند افسانے (جو مقامی روزناموں میں شایع ہوئے ہیں)، پڑھکر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ زمان صاحب اُن معاشرتی مسائل کا احساس رکھتے ہیں۔ جو قدیم و جدید کی آویزش کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں وہ حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ اُن کے افسانوں میں عام طور پر جذباتی وفور ملتا ہے مجھے امید ہے۔ کہ وہ آگے چلکر احساس کی شدت کا فکری احتساب کرکے اور اپنے کرداروں کو زیادہ سے زیادہ اپنے تہذیبی پس منظر سے مربوط کرکے اُن کی باطنی پیچیدگیوں کا احاطہ کرکے افسانوی ادب میں قابل قدر اضافہ کریں گے۔

(ڈاکٹر) حامدی کاشمیری
ریڈر شعبۂ اُردو کشمیر یونیورسٹی

# آئینۂ خیال

ریاست کے ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان فنکار کے چند مختصر افسانوں کا مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اس سے قبل کہ آپ اِن اوراق پھیلے ہوئے واقعات و واردات کی تھرکتی ہوئی تصویروں میں کھو جائیں یا کہانیوں کے پلاٹ اور کرداروں کے تأثر سے لُطف اندوز ہوں۔ میں ایک نقاد کی طرح رسماً آپکو "افسانہ" کی تکنیک، تاریخ اور نقد و نظر کے پیمانوں کی نشاندہی کر کے، کچھ توصیفی جملے لکھکر یا کنایۃً چند خامیوں کی طرف اشارہ کر کے "دیباچہ" یا "تمہید" لکھنے کے نہ تو اہل ہوں۔ اور نہ اس روایت کا قائل کہ ہر نوخیز فنکار اپنی تخلیقات کو منظرِ عام پر لاتے ہوئے کسی "عظیم" شخصیت سے پیش لفظ لکھوا کے کو اپنی کامیابی کے لئے فالِ نیک خیال کرے۔

مرزا محمد زمان آزردہ ریاست کے ادبی افق پر ایک ٹمٹماتے تارے کی طرح نمودار ہوئے ہیں۔ انکی تحریر میں مزاح کی شیرینی، زبان و بیان کے چٹخارے اور لطیف ظرافت کی ہلکی سی چاشنی، اکثر سنجیدہ موضوعات، المیہ کہانیوں بلکہ منظر کشی میں بھی اُن کی "انفرادیت" کی شان کو برقرار رکھے ہوئے ہے

ان کے موضوعات بالکل اچھوتے نہ سہی۔ پھر بھی ان پہلی کوششوں ہی سے یہ رجحان واضح ہوتا ہے۔ کہ وہ عام ڈگر سے ہٹ کر اپنے لئے ایک ایسی راہ بنا رہے ہیں۔ جو شاداب گلوں کی مہک اور پُر خار جھاڑیوں کی کسک سے معمور ہو۔ ایک نوجوان ذہن فلسفہ کی موشگافیوں اور حیات و کائنات کی دقیق گتھیوں کو سلجھانے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔ اس کے تجربات میں وسعت نہیں ہوتی۔ مطالعہ بھی کسی حد تک محدود ہوتا ہے۔ اور اگر ادب کی "حسن کاری" کو ایک روحانی فرحت و انبساط کا وسیلہ سمجھیں تو وہ اس بار گراں کی متحمل بھی نہیں ہو سکتی۔ لیکن مرزا آزردہ فلسفہ کے بھی ایک ہونہار طالب علم ہیں۔ اسی لئے انکی ہلکی پھلکی تخلیقات میں بھی (جنکو وہ صرف اپنے جذبات کی تسکین اور اپنے ذاتی سکون کا ذریعہ سمجھتے ہوئے قلم برداشتہ لکھ ڈالتے ہیں) ایسے مسائل کی جھلک نظر آتی ہے۔ جو ہمارے ذہن و فکر کو چونکا دیتے ہیں۔

کسی بھی فن میں عروج و کمال حاصل کرنیکے لئے مسلسل ریاض کی ضرورت ہے ابھی نوعمر آزردہ صاحب نے لڑکپن کی بھول بھلیوں سے نکلکر شباب کی رنگین قوس قزح میں قدم رکھا ہے۔ اور غم روزگار نے فرصت کے لمحات پر بھی شبخون مارا ہے۔ ان کی بے پناہ ذہانت اور انتھک لگن نے گلشن ادب میں ایسی سدا بہار پھلواریوں کی آبیاری میں اپنا خون جگر صرف کیا ہے۔ کہ ان ابتدائی نقوش میں ان عظمتوں کی پرچھائیاں ملتی ہیں۔ جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ ان کا خلوص فکر، زبان و بیان کا تیکھاپن، زندگی کے مسائل سے گہری دلچسپی اور کتاب کائنات کے گہرے مطالعہ کا شوق آزردہ صاحب کو اردو کا ایک مایۂ ناز اہل قلم بنا دیگا۔ اگر انہیں اپنی مادری زبان پر بھی کامل دسترس ہے

اور کشمیری نثر و نظم میں بھی ان کے تخیل کی رعنائی اور انداز کی برنائی کا جوبن چھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

اِس کتاب سے پہلے اُن کے انشائیوں کا مجموعہ "غبارِ خیال" اور انشائیہ نما مکاتیب "شیرین کے خطوط" قبولِ عام کی سند پا چکے ہیں۔ زیرِ خیال ہے ان افسانوں کو کتابی شکل میں پیش کرتے ہوئے جو یا تو اخبار و رسائل میں اشاعت پا چکے ہیں۔ یا ریڈیو سے نشر ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی شہرت میں اضافہ یا اردو ادب پر کوئی احسان کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا نہیں۔ بلکہ اپنے مزاج کی بوقلمونی اور اپنی فطرت کی رنگارنگی کا ایک اور روشن پہلو اجاگر کر رہے ہیں۔ تاکہ جو لوگ انہیں ایک زندہ دل بھائی کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ جو آہوں اور آنسوؤں کی گھٹی گھٹی فضا کو اپنی شوخئ گفتار سے آن کی آن میں قہقہہ زار بنا دینے میں مہارتِ تامہ رکھتا ہے، یا جو اُن کو ایک باوقار سنجیدہ اور فرض شناس "استاد" کے روپ میں پہچانتے ہیں۔ جسے اپنے پیشے کے تقدس پر پورا اعتماد اور اپنے فن پر مکمل عبور رہے۔ یا جو انہیں مشاعروں کی محفل کو لوٹنے والا ایک شیرین کلام شاعر ہی سمجھتے ہیں۔ وہ یہ جان لیں۔ کہ آزردہ ایک "افسانہ نگار" بھی ہے۔ اور اِس میدان میں بھی شہسواری کے جوہر دکھا سکتا ہے۔

اور یہ سب کچھ اُن کیلئے ابھی محض ایک تجرباتی عمل ہے۔ بیقرار لہروں کی مسلسل تڑپ کی طرح اپنے وجود و عدم سے بے نیاز۔ لیکن دریا کی گہرائیوں میں کیسے کیسے بے بہا موتی آسودہ ہیں۔ انکی قدر و قیمت کا ذکر ابھی قبل از وقت ہوگا مگر مجھے یہ یقین ہے۔ کہ خوب سے خوب تر کی تلاش کا یہ شوق آزردہ صاحب کو آسمانِ ادب کا نیرِ تاباں بنا کر لازوال شہرت و مقبولیت کے عروج تک پہنچائیگا۔

یہ سطریں لکھتے ہوئے ان افسانوں کے خالق کے بارے میں بھی چند جملے اور بڑھا دینا اس لئے ضروری سمجھتا ہوں۔ کہ فن کو پرکھنے کیلئے فنکار کی ذات اور شخصیت کو جاننے کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اور مجھے یہ شرف حاصل ہے۔ کہ میں نے آزردہ صاحب کو ان کے بچپن سے جوانی کے عہدِ رنگین تک بہت قریب سے دیکھا ہے اور ان کی زندگی جو ایک جہدِ مسلسل اور عزمِ مصمم کی منہ بولتی تصویر ہے۔ میری نظروں کے سامنے ارتقائی منازل طے کر رہی ہے۔ تقسیم ہند کی پرآشوب ہنگامہ خیزیوں میں ان کے والدین امرتسر میں کاروباری سلسلے میں مقیم تھے۔ جہاں سے اپنا سارا مال و متاع لٹا کر وہ اپنے لاڈلے نیر جواں بچے سمیت بمشکل جان بچا کر وطن پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ (آزردہ صاحب نے تقسیم ہند سے دو سال قبل امرتسر ہی میں آنکھیں کھولی تھیں) ان کا خاندان کشمیر کے معزز تجارت پیشہ حلقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ لیکن بدلے ہوئے حالات میں معاشی مجبوریوں نے کم سنی ہی سے آزردہ صاحب کو ملازمت کی الجھنوں میں پھنسا دیا۔ پھر بھی ان کی ذاتی کوششوں نے ان کو ایم۔ اے کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں سب سے ممتاز درجے میں کامیابی عطا کی۔ اور وہ شعبۂ اردو میں لیکچرار مقرر ہوئے۔ نامساعد حالات میں بھی انکی انتھک کوششوں اور علم و ادب سے والہانہ شغف نے اتنی کم مدت میں انہیں تصنیف و تالیف کے میدان میں جو نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ وہ ان کی فطری ذہانت و فطانت اور عزم و استقلال کی روشن مثال ہے۔ وہ دھن کے پکے، ہمت و حوصلہ کے دھنی ہیں۔ ابھی وہ جوش و خروش کے ساتھ

اعلےٰ منازل کی راہوں میں رواں دواں نظر آ رہے ہیں۔ وہ برابر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ٹھہرنے اور تھکنے کا نام نہیں لیتے۔ تعجب نہیں۔ کہ اُن کے عروج کی منزل ستاروں سے بھی آگے ہو۔ اور اُن کی ذات ملک و ملت کیلئے باعثِ افتخار ہو۔

"این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد"

حسن آباد۔ ۱۷ جولائی ۱۹۷۵ء

ناچیز:۔ اکبر جے پوری

"روپہ پہ رود"

مسجود سیلانی کا ایک تجرباتی سٹیج ڈرامہ
جس پر اُنہیں ۱۹۷۴ء کے جشنِ تمثیل میں اعزاز
عطا کیا گیا ہے۔ جلد ہی منظرِ عام پر آ رہا ہے

# پیش لفظ

"غبارِ خیال" اور شیریں کے خطوط کے بعد اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں چند افسانوں کا یہ مجموعہ "۔ ۔ ۔ اور وہ ٹاپ کر گئی" پیش کر کے اس وقت ایسی مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ جیسی ایک پُر خلوص میزبان کو اپنے شکر گذار مہمان کے سامنے یکے بعد دیگرے نعمتیں پیش کر کے ہوتی ہے۔ یہ افسانے اُس زمانے کی یادگار کے طور پر محفوظ کر رہا ہوں۔ جب میں ہر سمت قدم اٹھاتا تھا۔ پاؤں میں چلنے کی طاقت تھی۔ راستہ بھی دشوار نہیں لگتا تھا۔ مگر دوسری سمت سے کوئی آواز آ کے مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ دو چار قدم اُس راستے پر چلتا۔ تو تیسری طرف کی آواز پھر اپنی جانب متوجہ کرتی۔ اس طرح کچھ نقشِ قدم ہی میرا سرمایہ رہے۔ کوئی منزل نہیں۔ اور وہ نقشِ قدم بھی میرے اپنے ہی تھے۔ کسی انگلی تھامنے والے بزرگ کے نہیں۔ اب تک یہی حال ہے۔ میں جس طرف کو دیکھتا ہوں۔ اپنے چند نقشِ قدم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر کوئی منزل نہیں۔ راستے اب تک دھندلے دھندلے سے ہیں۔ اور میں روشنی کے انتظار میں ہوں۔ کبھی یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ منزل میری طرف بڑھ

رہی ہے - اور کبھی یہ کہ میں منزل کی طرف بڑھ رہا ہوں - اس سفر میں میری کم مائیگی میری ہمسفر ہے - مگر ہمت نے ترددات کو کبھی لیشتارہ سر نہ بننے دیا -

یہ کہانیاں سوائے ایک یا دو کے مختلف رسائل اور اخباروں میں چھپ چکی ہیں - ان ہی میں سے ایک کہانی پہ ہیں لے مجموعے کا ٹائیٹل رکھا ہے - اس لئے کہ وہ لکھکر میں یہ بھول گیا - کہ یہ افسانہ ہے - منظر نگاری اور سراپا کی مثالیں ان کہانیوں میں آپ کو بہت کم ملیں گی - ایسا میں نے جان بوجھ کر کیا ہے - اس لئے کہ واقعات میری نظر میں ہمیشہ اہم رہے ہیں ان کہانیوں کے واقعات اور کردار ہماری عام زندگی سے دُور نہیں - اس لئے قاری اپنی استعداد کے مطابق اس کمی کو خود ہی پورا کر سکتا ہے ممکن ہے - اسے راقم کی کور ذوقی بھی خیال کیا جائے -

بہر کیف جو کچھ ہے - آپ کے سامنے ہے - اور آپ کی رائے آپ کے لئے صحیح رہنما ـــــــ ممکن ہے - میری بھی رہنمائی اس سے ہو - اور اپنے افسانوں کا دوسرا مجموعہ "برف میں آگ" آپ کے سامنے پیش کرنے سے پہلے، اس کی روشنی میں دوبارہ دیکھ سکوں

مصنف

# آخری سلام

جمیل سگریٹ پہ سگریٹ جلائے جا رہا تھا۔ لمبے لمبے
کش لیکر اس کے دھوئیں کے پردے میں اسے کیا نظر آرہا تھا۔ جمیل کے
چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ ظاہر کر رہے تھے۔ لوگ ایک ایک کر کے
جا رہے تھے۔ اور وہ سب کو نظروں ہی نظروں سے رخصت کیے
جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے دو سال کے نقوش ابھر ابھر کر
مٹ رہے تھے۔ آج یونیورسٹی میں اس کا آخری دن تھا۔ اس کے
سیشن کے سب لوگ آگئے تھے۔ وہ اب بھی یونیورسٹی میں
آسکتا تھا۔ مگر بیتے ہوئے دن اس کے ساتھ کیسے آسکتے تھے
اس لحاظ سے آج کا دن بہت ہی اہم تھا۔ کتنی امیدیں اس دن کے
ساتھ وابستہ کر رکھی تھیں۔ کتنے بت آج کے اس مندر میں سجا کر
رکھے تھے۔ مگر وہ سب کے سب مورت ایک ایک کر کے گرنے لگے تھے۔
یہ سب بت اس نے ہی تخیل کے تھے کہ خود اسی نے اب بت بنا کر اس سے

دُور جا رہے تھے۔ وہ گاؤن پہنے ہاتھ میں ایم۔اے کا سارٹیفکیٹ لئے پہنے خیالات کو سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ بکھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا۔ کہ ہونٹ ساکت ہونے کے باوجود بھی وہ بول رہا تھا۔ کوئی سامنے سے گذرا۔

"جمیل بھائی! کیا کر رہے ہیں۔" اُس نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں۔ آج کا دن بھی گذر گیا۔ جمیل نے جواب دیا مگر سننے والا جا چکا تھا۔ اور جمیل کے ہونٹ اس حرکت کے بعد سمندر کی لہروں سے پھر خاموش ہو چکے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر ہمیشہ کھیلنے والی مسکراہٹ آج غائب تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دور خلا میں تک رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں جانے والوں پر لگی تھیں۔ کوئی اُس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ مگر وہ سب کو دیکھتا جا رہا تھا۔

اُسی وقت شکیلہ اُس کے سامنے آکر رک گئی۔ جمیل اسکو دیکھنے لگا۔ مگر ہونٹ خاموش رہے۔ اُس کی آنکھیں بھی خاموش تھیں۔ وہ بُت بنا صرف دیکھتا رہا۔ شکیلہ کچھ دیر خاموش رہی۔ لیکن کب تک خاموش رہتی۔ اس سے رہا نہ گیا۔ اور اُس نے اس سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

"جمیل ہم جا رہے ہیں۔ ہمارا آخری سلام قبول کر لو۔ زندگی کا کیا بھروسہ۔ ہمارے راستے اب بہت دور ہو گئے۔"

یہ کہتے ہوئے شکیلہ کے دو آنسو ٹپکے۔ جمیل پھر بھی بے حس کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ شکیلہ دو قدم آگے بڑھی۔ اور جمیل کے بالکل قریب آگئی۔ وہ اس وقت حسرت و یاس کا ایک پیکر نظر آرہی تھی۔ اور جمیل ایک بے جان لاش۔ اچانک شکیلہ اپنے دل میں بے چینی محسوس کرتے ہوئے جمیل کا بازو پکڑ کر اس کو جھنجوڑنے لگی۔ جمیل نے جیسے خواب سے چونکتے ہوئے کہا۔

"آپ!"

"ہاں ہم ہیں ہم" شکیلہ نے جلدی جلدی کہا۔

"آپ! آپ بھی جا رہی ہیں" جمیل نے ایسے کہا جیسے خواب میں بڑبڑا رہا ہو۔

"ہاں جمیل! ہم جا رہے ہیں"۔ شکیلہ نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔ جمیل نے پیاسا سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ "خدا آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔ آج ٹھہر جاتیں۔ تو اچھا تھا۔

شکیلہ نے رو ہانسی ہو کر جواب دیا۔ ابا جان بھی آ گئے ہیں آج ہی وہ بھی جا رہے ہیں۔ ہم لوگ تھوڑی دیر کے بعد کار کا میل سے روانہ ہو گئے

جمیل خاموش رہا۔ اُس کی نظریں شکیلہ کے گلاب جیسے شگفتہ چہرے پر پریشانی اور اضطراب کی اُن لہروں کو تک رہی تھیں۔ جو جلدی جلدی جمیل کے ذہن میں نہ مٹنے والے خطوط کھینچ رہی تھیں۔

شکیلہ نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "جمیل ہو سکے۔ تو ہمیں معاف کرنا۔ ہم آپ کی قدر نہ کر سکے۔

جمیل نے نہایت ہی اطمینان سے کہا۔ "شکیلہ میں آپ سے کبھی ناراض نہیں تھا۔ اس سارے وقت کو ایک خواب سمجھ کے بھلا دیجئے خدا حافظ"

اتنا کہہ کر جمیل وکٹوریہ گیٹ سے اندر آ گیا۔ اور شکیلا اس طرف کو دیکھتی رہی۔ جہاں سے وہ گیا تھا۔

اُس کی نظروں کے سامنے دو سال کے واقعات گھوم رہے تھے۔ جیسے اُسے کوئی فلم دکھایا جا رہا ہو۔ اُسے یاد آیا۔ جب جمیل پہلی دفعہ کلاس میں آیا تھا۔ تو کسی نے اس کو پسند نہیں کیا تھا۔

کیونکہ وہ کلاس کا تیرھواں سٹوڈنٹ تھا۔ شکیلہ کو اُس کا ہمیشہ مُسکراتا ہوا چہرہ اور اُس پر ایک معصومیت کا پردہ بہت پسند آگیا تھا۔ مگر دوسرے سٹوڈنٹس کی ناراضگی مول لینے کی ہمت اُسمیں نہیں تھی

جمیل بظاہر مُسکراتا نظر آتا۔ مگر اُس کی گفتگو ہمیشہ سنجیدہ ہوا کرتی تھی۔ شکیلہ کو یاد آیا۔ جب ایک دفعہ ڈاکٹر احمد نے پوچھا تھا کہ آپ کے دوست کون کون سے ہیں۔ تو اُس نے جواب دیا تھا۔ کہ میرے صرف دو دوست ہیں۔ ایک میرے اباجان اور دوسری میری امی۔ کلاس میں سب ہنسنے لگے تھے۔ مگر ڈاکٹر احمد نے پھر دوستی کے موضوع پر سنجیدگی سے جمیل سے بحث کی تھی۔

جمیل یوں تو باتیں بہت کم کرتا تھا۔ مگر جب بولتا تھا۔ تو ایسا لگتا تھا۔ کہ کسی ناول یا ڈرامے یا فلم کا ہیرو بول رہا ہے۔ عجیب شخصیت تھی اُسکی۔ وار کرنے سے زیادہ وار سہہ لینا پسند کرتا تھا۔ بڑی سے بڑی بات، وہ ایسے کہہ دیتا۔ جیسے کوئی معصوم بچہ نادانستہ بول رہا ہو۔

جمیل کی باتیں ایک ایک کر کے شکیلہ کے ذہن میں آ رہی تھیں

ایکدفعہ اُس نے جمیل سے پوچھا تھا۔ "آپ کہاں رہتے ہیں"۔ تو اس نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔ "آپ کے خیالوں میں کھویا رہتا ہوں"۔ اور جب شکیلہ نے پوچھا تھا کہ "آپ کس حال میں رہتے ہیں۔ تو جواب دیا تھا "جو آپ کو ایکدفعہ دیکھے۔ ہمیشہ بے حال ہی رہتا ہے"۔

شکیلہ تصور ہی تصور میں ان جملوں سے مزا لیتی رہی۔ پھر اُس کے سامنے وہ دن آئے۔ جب کلاس میں جمیل اس کو گھورتا رہتا۔ کئی بار اس نے جمیل کو چانس دیا۔ مگر ایسا لگتا تھا۔ کہ وہ صرف جواب دینا جانتا ہے۔ اور اپنی طرف سے کچھ کہنا۔ اُس کے لئے ناممکن ہے۔ ادھر شکیلہ اس کی آنکھوں کی زبان سمجھنے سے قاصر تھی۔

ڈیپارٹمنٹ میں مشہور ہو گیا تھا۔ کہ یہاں ایک فلاسفر پیدا ہو رہا ہے۔ اور وہ ہے جمیل۔ جب پریویس میں جمیل کو پہلی پوزیشن ملی تو شکیلہ نے بھی مبارکباد دی تھی۔ مگر جمیل نے کہا تھا۔ کہ فائنل کے بعد شکیلہ کو یاد آیا۔ کہ جب وہ جوزف سے اس لئے ملنے لگی تھی۔ کہ جمیل اُس کی طرف متوجہ ہو۔ تو جمیل نے اُس کا کتنا بُرا اثر لیا تھا۔ شگفتہ نے اُس سے کہا تھا۔ کہ جمیل کہہ رہا تھا۔ کہ ہر ایک کو اپنے

اوپر اختیار ہے۔ شکیلہ ایک پھول ہے۔ میں اُسے دیکھتے رہنا چاہتا ہوں۔ میرے میلے ہاتھ اگر اُس کو لگ جائینگے۔ تو اُس کی رنگت میں فرق آجائیگا میں جوزف کو اتنا باذوق نہیں سمجھتا۔ وہ باغ میں بیٹھے ہوئے بھی اپنے کانوں میں پھول لگائے رہتا ہے۔ وہ عام لوگوں کی طرح سایوں کے پیچھے بھاگنے کا عادی ہے۔ شکیلہ تو روشنی ہے۔

شکیلہ نے ایک آہ بھری۔ اُسے یاد آیا۔ کہ جب ایک دن ایس ایس ہال میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ اور جمیل نے غزل سنائی تھی۔ جس کا ایک ایک شعر اسی کے لئے تھا۔ شگفتہ اُسوقت اُس کے چٹکیاں لے رہی تھی۔ اور وہ خود پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ کہ وہ حقیقت کو الفاظ کے پردے میں کیوں پیش کر رہا ہے۔ اُس کا فلسفہ کیا ہو گیا۔ اُس کے جی میں آیا کہ وہ جمیل سے کہے گی۔ کہ وہ صاف صاف کہدے۔ کہ وہ اُس سے کیا چاہتا ہے۔ مگر وہ کبھی اُس کے سامنے ایسی بات کرنے کی جراءت نہ کر سکی۔ وہ جمیل کو کنکھیوں سے دیکھتی رہتی۔ لیکن اُس سے نظریں ملانیکی جراءت نہ ہوتی۔ وہ اکثر ایسے سمجھتی۔ کہ جمیل اُسے دیکھتا رہے۔ مگر اُس کا دلفریب حُسن، جمیل کے دل کی کیفیت کبھی اُس کے ہونٹوں پر لانے میں کامیاب نہ ہوا

ایک دن جب کلاس میں لڑکوں اور لڑکیوں نے جمیل کو اپنا کلام سنانے پر مجبور کیا تھا۔ تو جمیل نے ایک قطعہ سنایا تھا ۔

دیکھ بیٹھے ہیں یوں غم کے مارے بہتے دریا کے ساکت کنارے
دل میں طوفان ہزاروں اٹھے ہیں لب ہیں خاموش پھر بھی ہمارے

شکیلہ کو یہ اشعار اب بھی یاد تھے ۔ اس دن سب لوگ چلے گئے تھے ۔ اور وہ دیر تک کلاس میں خاموش بیٹھی رہی تھی ۔

شکیلہ کے ذہن میں ایک اور بات آئی ۔ جب اس نے جمیل کو محض تحریک دینے کے لئے اپنی طرف گھور گھور کے دیکھنے پر ٹوکا تھا اور پھر جمیل نے اس کی طرف دیکھنا ترک کیا تھا ۔ اس نے اس کے بعد کئی دفعہ اس کو نظارہ کرنے کی دعوت ، دی تھی ۔ مگر جمیل ان آدمیوں میں سے نہیں تھا ۔ جو اسی دستر خوان پر بیٹھنے والے ہوں جہاں سے انہیں ٹھکرا دیا گیا ہو ۔ خواہ اس پر اس کی پسند کی ہی ضیافتیں کیوں نہ چنی ہوئی ہوں ۔

اس دن کے بعد ، آج ہی جمیل نے شکیلہ کی طرف دیکھا تھا ۔ اور وہ بھی بہت ہی مختصر وقت کے لئے ۔

شکیلہ کو یہ سب ایک خواب سا نظر آ رہا تھا۔ مگر یہ اُسکی زندگی کی ایک حقیقت تھی۔ کہ وہ اپنے محبوب کو ٹھیک سے رخصت بھی نہ کر سکی۔ شکیلہ ان ہی خیالات میں غرق تھی۔ کہ اُس کے سامنے جمیل پھر ظاہر ہوا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے اپنے دلفریب انداز میں اس سے کہنے لگا۔

"شکیلہ مجھے اپنا لو۔ میں تمہارا ہوں۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ شکیلہ میرا دل پھٹ جائیگا۔ دیکھو میری کیا حالت ہو رہی ہے تم ہی میری زندگی بچا سکتی ہو۔ بچاؤ گی نا! شکیلہ! شکیلہ"۔

شکیلہ دیوانہ وار اپنے بازو کھولے آگے بڑھی۔ اور دھم سے گر پڑی۔ زمین پر پڑتے ہی اُسے محسوس ہوا۔ کہ وہ اُس کا اپنا ہی سایہ تھا جمیل نہیں۔ وہ کپڑے جھاڑتے ہوئے اُٹھی۔ بائیں جانب سے ایک رکشا تیزی سے آ رہا تھا۔ اس پر بیٹھا ہوا ایک بزرگ صورت آدمی آوازیں دے رہا تھا۔

"منی! منی!"

شکیلہ نے ابا جان کی آواز پہچان لی۔ اس کی زبان سے نکلا۔

"ابو"۔

جس کے جواب میں رکشا اس کے سامنے رُک گیا۔ اور اس کا باپ کہہ رہا تھا۔

"منّی تم نے بہت دیر کر دی۔ اگر کالکا میل کے آنے میں ایک گھنٹے کی دیر نہ ہو جاتی۔ تو ہمارا ٹکٹ ہی رہ گیا تھا۔ چلو جلدی کرو"۔

پھر رکشا والے سے کہا۔ "بھائی چلو ریلوے سٹیشن چلو"۔

اس دوران شکیلہ رکشے پر بیٹھ چکی تھی۔ مگر وہ یہ سوچ رہی تھی۔ کہ عمر بھر اسی دھوکے میں کیوں نہ رہی۔ کہ جمیل اس کے سامنے اس سے پیار کی باتیں کر رہا ہے۔ اور وہ اُسے دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہی ہے۔

رکشا یونیورسٹی ایریا سے باہر آ گیا۔ اور دو دل ایکدوسرے کے سامنے ہو کر متوازی خطوط کی طرح اپنے راستوں پر آگے بڑھے۔

# فرار

روشن نے خط کو کئی بار پڑھا۔ مگر اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آرہا تھا۔

خط میں احمد کی ماں نے صرف اتنا ہی لکھا تھا۔ "احمد بیمار ہو گیا ہے مگر اتنا نہیں۔ کہ تم خدانخواستہ پریشان ہو جاؤ۔ ہاں تمہارا یہاں آنا ضروری ہے۔"

"روشن مدت سے وہاں نہیں گیا تھا۔ لیکن اسوقت تو اب جانا ضروری ہو گیا تھا۔ اس لیئے وہ جلدی ہی گھر سے روانہ ہو گیا راستے میں وہ بے حد پریشان رہا۔ جس چیز سے خط میں دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ وہی حالت اس پر غالب آرہی تھی۔ دو گھنٹے کے بعد وہ سرینگر پہنچا۔ یہاں سے اُس نے فوراً ہی ایک ٹیکسی لے لی۔ اور عابکدل کی طرف روانہ ہوا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ ٹیکسی اُڑ کر پہنچے۔ اگر کہیں راستہ نہ ملتا۔ اور ٹیکسی کو ٹھہرنا

پڑتا۔ تو وہ بیقرار ہو جاتا۔ اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہو رہے تھے۔ احمد کے مکان کے پاس گاڑی کھڑی ہو گئی۔ کرایہ ادا کر کے وہ اندر چلا گیا۔ سبھوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ صرف احمد نظر نہیں آیا۔ جس کو اس کی نظریں بری طرح تلاش کر رہی تھیں آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔ کہ "احمد کہاں ہے"؟

کسی اور کے جواب دینے سے پہلے احمد کے چھوٹے بھائی راجو نے جو کوئی چار برس کا تھا۔ کہا۔ "بھیا! وہ تو پاگل ہو گیا ہے"۔

اس کی ماں نے اس کے منہ پہ ہاتھ تو رکھا۔ مگر وہ بھی یہی کہنے پہ مجبور تھی۔ ہاں اتنا فرق ہوا۔ کہ اس نے اصلیت کو الفاظ اور لہجے کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بیٹے اس کو کچھ عجیب بیماری لگ گئی ہے۔ اس وقت تو سو رہا ہے۔ تم چائے پی لو۔ جب تک جاگ جائیگا"۔

روشن نے ضد کرتے ہوئے کہا۔

میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک نہ احمد کو دیکھوں۔۔

اسے کیا ہو گیا آخر!

ابھی ایک ہی مہینہ پہلے تو وہ سوپور آیا تھا۔ اور بالکل ٹھیک تھا"
احمد کی ماں کی آنکھیں بھر آئیں۔ اور اُس نے اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا۔
"بیٹا! قسمت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ یہ تو ایک آن میں انسان
کی کایا پلٹ دیتی ہے"۔

روشن نے تسلّی دیتے ہوئے کہا۔ "آپ بھگوان پر بھروسہ رکھئے
سب ٹھیک ہو گا۔ اچھا میں اُن سے ملتا ہوں۔ آپنے کمرے میں ہی
ہیں نا"۔

روشن کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو۔ اور کہہ نہ
پا رہی ہو۔ اس لئے روشن نے پوچھا۔ "بات کیا ہے؟ آپ شاید
کچھ کہنے سے جھجک رہی ہیں"۔

اُس نے اپنی حالت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹا کچھ
نہیں۔ ہاں اپنی گھڑی یہیں رکھو۔ اور دیکھو احمد سے وقت کے
بارے میں کچھ مت کہنا۔ دن کا نام نہ لینا۔ مہینے یا ہفتے کے بارے میں
کچھ نہ کہنا"۔

روشن نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ایسا کیوں؟"

اُس نے ایک آہ بھرتے ہوئے جواب دیا "میری بدنصیبی ہے۔ کیا اُس کو جیسے دشمنی صرف وقت کے ساتھ ہی ہے۔ اپنے کمرے سے کیلنڈر نکال دئے ہیں۔ ڈائری کو نوچ کے پھینک دیا۔ کوئی اگر وقت کے متعلّق کچھ کہے۔ تو مارنے کو دوڑتا ہے۔ کمرے کو یوں بند کیا ہے کہ دن کا پتہ لگے نہ رات کا۔"

روشن حیرت و حسرت کا مارا کچھ بھی نہ سمجھ رہا تھا۔ ناچار اُس نے ایسا ہی کیا۔ اور ڈرتے ڈرتے احمد کے کمرے کے اندر گیا۔

جوں ہی احمد نے روشن کو دیکھا۔ تو باچھیں کھل اُٹھیں۔ دوڑ کر گلے سے لگایا۔ بٹھایا۔ اور روشن کو اُس میں پاگل پن کے کچھ بھی آثار نظر نہ آئے۔ سوائے اس کے کہ داڑھی بے ترتیبی سے بڑھی ہوئی تھی جس نے اُسے شکلاً ہپی سا بنا دیا تھا۔ وہ اس گتھی کے سلجھانے میں ناکام تھا۔ جب اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ تو پوچھ ہی لیا "یہ گھر بھر کو پریشان کیوں کر رکھا ہے؟ بیچارے رو رہے ہیں ماں تو بات بھی سیدھی طرح نہیں کر پاتیں۔"

احمد نے جواب دیا۔ "وہ سب پاگل ہیں پاگل۔"
روشن نے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "پاگل وہ ہیں یا تم جس نے
انہیں ایسا بنا دیا۔ کب سے اسطرح پڑے ہو؟"
احمد نے بیچارگی کے انداز میں کہا۔ "یہ کب کی یاد مت دلاؤ۔
میں تہیہ کئے ہوئے ہوں۔ کہ اپنے ذہن کو آرام دیدوں۔ وقت کے
خیال نے مجھے بہت ستایا ہے۔ فتنے کی اصل جڑ تو یہی گھڑی ہے۔
بس کل انتظار کرو۔ تو گھڑی دیکھنے سے یہ انتظار مصیبت ہو جاتی ہے۔
یہی وقت کسی سے ملنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ کسی سے بچھڑنے پر بھی۔
دن اور رات کے احساس نے میری زندگی اجیرن بنا دی ہے انسان نے
گھڑی کیلنڈر وغیرہ کو اپنی سہولت کیلئے بنایا تھا۔ مگر مجھ پر تو اس نے
بہت ظلم کر دیا۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ کچھ دن ایسے عالم میں گذاروں۔
جہاں وقت کی کوئی قید نہ ہو۔ یہاں تک کہ وقت کا کوئی خیال ہی نہ ہو
نہ کسی سے ملنا ہو نہ کچھ۔ اگر ایسا ہو بھی تو اس کے لئے گھڑی کے کسی خاص
اشارے کی ضرورت نہ ہو۔ بغیر گھڑی اور کیلنڈر کے کوئی پروگرام ہی
نہیں بن سکتا۔ پہلے کام ہوگا۔ پھر اس کا احساس۔ پہلے ہی انسان

ایک قیدی کیطرح گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ گھسیٹا نہیں جائے گا
میں فرار چاہتا ہوں"۔

روشن نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔ "گویا تم زندگی سے بھاگنا
چاہتے ہو۔؟"

احمد نے معصومانہ انداز میں کہا۔ زندگی مجھے پیاری ہے اسی لئے
میں وقت سے فرار چاہتا ہوں۔ جو زندگی کے مزے کو کرکرا کر دیتا ہے۔"

روشن نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "تم سچ مچ پاگل ہو گئے ہو
تم موت بھی نہیں چاہتے۔ اور زندگی سے بھی پیار نہیں ہے۔ وقت تو
زندگی ہے۔ رفتار سے ہی حیات کا پتہ چلتا ہے۔ تم گھڑی کو دور رکھ
سکتے ہو۔ دن اور رات سے چھپ سکتے ہو۔ مگر اپنے نبض کی رفتار کو
کیا کرو گے۔ اگر تم مرنا نہیں چاہتے۔ دل کی دھڑکن کو کیونکر خاموش
کر سکتے ہو۔ اپنی سانسوں کی رفتار سے کیونکر بچ سکتے ہو۔
مشکل تو خیر مشکل ہے۔ تو عقلاً بھی ہیبی بن گئے ہو!"

"احمد یہ باتیں سنکر کبھی ہاتھ اپنی نبض پر رکھتا۔ اور کبھی دل کو
ٹٹولتا۔ اس پر ایک ہیجانی کیفیت سی طاری ہو گئی۔ اور اچانک

وہ رونے لگا۔ اور روتے ہوئے کہا۔

"روشن! میرے بھائی۔ مجھے بتاؤ۔ میں کیا کروں۔ مجھے لوگوں نے تنگ کیا ہے۔ مجھے اپنی مرضی کے خلاف لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ مجھ سے انکار نہیں ہو پاتا۔ میں کل کو بھلا دینا چاہتا ہوں۔ اور "آج" میرے گلے اسطرح پڑتا ہے۔ کہ میری یہ حالت ہو گئی"۔

"روشن کے دل پر بھی تھوڑی دیر کے لئے کچھ اثر ہو گیا۔ مگر اپنے آپ پر جلدی ہی قابو پا لیا۔ اور بزرگانہ انداز میں کہا۔

اپنے آپ کو پریشان مت کرو۔ جو چاہو وہی کرو۔ مگر اُن لوگوں کو پریشان مت کرو۔ جو تمہارے اپنے ہیں۔ آنیوالی ملاقاتوں کا غم مت کرو۔ اُن واقعات پر جان مت دو۔ جو ابھی رونما نہیں ہوئے بس غالب کی بات یاد رکھو ؎

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

چلو اُٹھو۔ انسان بنو۔ اور زمانے کی گردش کے ساتھ گردش میں آجاؤ۔

تھوڑی دیر کے بعد دونوں ہنستے کھیلتے باہر آئے۔ امجد کی ماں بلائیں لینے لگی۔ گھر کے اور لوگ چھوٹے نہیں سمار رہے تھے۔ راجو نے آکر بھائی کا ہاتھ پکڑا۔ اور اُسے ہلاتے ہوئے کہا۔

"بھیا۔ کیا تم اب بھی پاگل ہو۔"

"امجد نے اُس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا۔ "بالکل نہیں"۔

# ترکِ وفا

سلیم - پندرہ برس سے مسلسل سگریٹ پیئے جا رہا تھا۔
اب سلیم اور سگریٹ ایکدوسرے کے لیئے لازم و ملزوم ہو کے رہ گئے تھے۔ کئی دفعہ اُس کے جی میں آیا۔ کہ وہ سگریٹ پینا ترک کرے۔ مگر ہر دفعہ اس کی ایش ٹرے، جو تھوڑی ہی دیر میں بھر جاتی پڑے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑے اُسے یاد دلاتے کہ سے

جام سے توبہ شکن توبہ میری جام شکن
سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

اُس نے کئی دفعہ یہ سمجھنے کی کوشش کی۔ کہ وہ سگریٹ کیوں پیتا ہے۔ اس لئے کہ یہ سمجھنے کے بغیر وہ کیونکر اس عادت کو ترک کر سکتا تھا۔ مگر ہفتے میں کئی دفعہ اُسے یہ خیال ضرور آتا۔۔۔ کہ وہ سگریٹ نوشی چھوڑ دے۔
آج بھی سلیم عادتاً اسی مسئلے پر سوچ رہا تھا۔ کہ وہ سگریٹ چھوڑ

اس کے ساتھ ہی وہ اپنے تصورات میں اسقدر کھو گیا۔ کہ ہر چیز سے
بے خبر ہو گیا۔ اسے اس وفادار دوست کی ایک ایک بات یاد آ رہی
تھی۔ اس کے ذہن میں مختلف اوقات اور مختلف باتیں گھومنے لگیں
اسے بچپن کے وہ دن یاد آ گئے۔ جب وہ صرف نو برس کا تھا۔ اور
ان کے ایک نوکر نے اس کو سگریٹ پینے کی عادت ڈال دی۔ ابتدا میں
وہ مہمان خانے کے سگریٹ کیس میں سے چرائے ہوئے اعلیٰ سگریٹ
پی لیتا تھا۔ لیکن بعد میں اسے اپنی جیب خرچ کے پیسے اس معشوق
کی نذر کرنے پڑتے تھے۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی بازار میں ملنے والے
گھٹیا سگریٹ اسے پی لینے پڑتے۔ اس کے نان سموکر دوست جب
اس سے پوچھتے۔ کہ وہ سگریٹ کیوں پیتا ہے۔ تو وہ لاجواب ہو جاتا۔
مگر پیے جا رہا تھا۔ کئی ایسی باتیں اس کو یاد آ رہی تھیں۔ امتحان کے
زمانے میں اسے سگریٹ کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اس کے لئے یہ ایک
خواب آور دوا کا کام دیتا۔ نیند جیسے دشمن سے اس کو چھٹکارا
مل جاتا۔ اس کی زبان جل جاتی۔ منہ کا ذائقہ بدل جاتا۔ اس کے
سونگھنے کی قوت سگریٹ کی بو کی اسقدر عادی ہو گئی تھی۔ کہ اسے

تازہ ہولے سے جیسے چڑھ ہو۔ اور وہ بار بار پاک صاف ہوا سگریٹ کے دھوئیں سے آلودہ کرنے پر تلا ہوا نظر آتا۔ اُسے یاد آیا۔ کہ سگریٹ سے اُس نے فائدہ کے کام بھی لئے تھے۔ اکثر اُس نے اپنی جھجک مٹانے کیلئے بھی سگریٹ کا استعمال کیا تھا۔ اپنی خفت کو اُس نے سگریٹ کے دھوئیں کے ساتھ اُڑایا تھا۔ اور وہ بات کرنے کے قابل بن گیا تھا۔ اکثر وہ اس کے دھوئیں سے پیدا ہونے والے نقوش سے لُطف اندوز ہوا تھا۔ امتحان کے زمانے میں وہ ہر نشست میں دو تین دفعہ امتحان گاہ سے باہر سگریٹ پینے کے لئے چلا جاتا۔ اور واپس آکر وہ ایک نئے عزم کے ساتھ سوالات کے جواب لکھنے بیٹھتا۔ سینما ہال میں بھی وہ چوری چھپے سگریٹ پینے کی کوشش کرتا۔ اسی لئے اسے اکثر ریڈنگ روم سے تھوڑی ہی دیر بعد اُٹھ کے چلا جانا پڑتا۔

سلیم انہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ کہ اچانک اُسے خیال آیا جیسے اُس نے سگریٹ چھوڑ دیا ہو۔ اُس کی بیوی خوش ہے۔ کہ سگریٹ والے کا ۱۵۰ روپے کا ماہانہ بل اب نہیں آئیگا۔ اُس کے اعصاب کے اندر ایک پھرتی سی دوڑ گئی ہے۔ چہرے پر کچھ سرخی آگئی ہے۔

Cough Expectorants کا خرچہ کم ہو گیا ہے۔ مگر جن لوگوں کو
وہ سگریٹ پیش کر کے اپنے آپ پر مہربان بنا لیتا تھا۔ وہ لوگ
ہاتھ سے جاتے نظر آئے۔ اسی ادھیڑ بن میں تھا۔ کہ سگریٹ کا
ایک خاکہ سا ذہن میں ابھرا۔ جو اس سے یہ کہہ رہا تھا۔ "کیا تم سے یہی
توقع تھی۔ کہ پندرہ برس کے بعد دوستی ترک کر دو گے۔ کیا یہی نباہ ہے
جس کا ساتھ اٹھتے بیٹھتے پندرہ برس تک دیا ہو۔ اس سے علیحدہ ہونا
کیا اسقدر آسان ہے۔ کہ تم نے مجھے ایکدم چھوڑ دیا" سلیم سوچنے لگا
سچ تو ہے۔ اس ترک وفا پہ ایک مرثیہ لکھا جانا چاہیئے۔ اگر کوئی دوست
پل بھر کے لئے جدا ہو جائے تو کتنا دکھ ہوتا ہے۔ اور یہ تو پندرہ
برس کا ساتھی ہے۔ جس کے بغیر میں نے کوئی کام سنجیدگی سے نہیں کیا۔
میرے ہر قہقہے، ہر غم میں اس نے میرا ساتھ دیا۔ جب میرا کوئی ساتھی
نہ ہوتا۔ نیند بھی مجھ سے کوسوں دور بھاگتی۔ بیوی سے جھگڑا ہوتا
مالی پریشانیاں مجھے گھیرتیں۔ سیاسی مسائل میں میں الجھا ہوتا
بے روزگاری نے پریشان کر رکھا تھا۔ ان حالات میں صرف اس نے
مجھ سے وفا کی۔ اس کا مزا یا اس کی تلخی ہمیشہ ایک جیسی رہی۔ لیکن اگر

ہو سکتا ہے۔ کہ میں اسے چھوڑ دوں۔ یہ خاکہ پھر کہنے لگا۔ کیا میری قربانیوں کا انجام یہی تھا۔ میری وفاداریوں کا صلہ یہی تھا۔ میں گن گن ہاتھوں سے گذر کے تمہارے ہونٹوں میں دم توڑ دیتا تھا۔ میں تمہارے لئے جلتا رہا۔ پروانہ ایک دفعہ شمع پر نثار ہوتا ہے۔ میں نے لاکھوں جنم لئے۔ اور ہر جنم میں اپنے آپ کو تم پر نثار کیا۔ اب بھی کروڑوں جنم لینے پر تیار ہوں۔ مگر آہ تم نے میرے ایثار کی قدر نہ جانی۔ تم آدم زاد بیوفا ہو۔ تم سب کچھ ہو سکتے ہو۔ مگر وفادار نہیں ہو سکتے۔ تم نے آج تک کس سے وفا کی ہے؟ باغوں میں پھول لگاتے ہو۔ پھر انہیں اپنے گلے کا ہار بنانے کے لئے اُن سے اُن کی زندگی چھینتے ہو۔ جانوروں کو پال لیتے ہو۔ اور پھر وقت آنے پر اُن کی کھال تک استعمال میں لاتے ہو۔ جس چیز کو آج پسند کرتے ہو۔ وہی چیز کل ناپسند ہو جاتی ہے۔ تم اپنی غرض کے وفادار ہو بس۔ مگر یاد رکھو تم ہر چیز سے سیر ہو سکتے ہو۔ مگر مجھ سے نہیں۔ میں ہمیشہ اپنے اسی انداز سے تم سے وفا کرونگا۔ تم آزما کے دیکھو ؎

جذبۂ عشق سلامت ہے تو انشاءاللہ
کچے دھاگے سے بندھے آئینگے سرکار چلے

جلدی ہی تم میری طرف جھک جاؤ گے۔ اور پھر اسی آن بان سے مجھکو ہونٹوں سے لگا کر میری اداؤں میں کھو جاؤ گے"۔

اچانک سلیم کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کی انگلی میں آگ کی آنچ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ خیالات کی دنیا سے نکلکر اس ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ جسے اس نے ابھی جھٹکا تھا۔ سگریٹ جلتے جلتے انگلیوں تک پہنچ گیا تھا۔ اب وہ دور فرش پر گرا تھا۔ ہلکا ہلکا دھواں اس سے اب بھی اُٹھ رہا تھا۔ اور وہ اب بھی سلیم کے ہونٹوں سے لگنے کیلئے بے چین تھا۔ سلیم کی انگلیاں بے اختیاری سے میز پر پڑے ہوئے سگریٹ کیس میں سے سگریٹ لینے لگیں۔ سگریٹ سلیم کے ہونٹوں سے لگا۔ اور سلگ بھی گیا۔ دو تین کش لگانے کے بعد سلیم کو اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی۔ اور بڑبڑایا "میں بھی کتنا بیوقوف ہوں"۔

# ایثار

ڈیپارٹمنٹ میں سبھوں کی نظریں امجد پہ تھیں۔ مگر امجد کی نگاہوں کا مرکز سکینہ بن چکی تھی۔ امتحان نزدیک آرہا تھا۔ سب لوگ تیاری میں مگن تھے۔ لائبریری کا ریڈنگ روم واقعی ریڈنگ روم نظر آرہا تھا۔ سیمینار میں رات گئے تک ڈسکشن ہوتے۔ لیکن امجد اپنی تیاری سے زیادہ اوروں کو تیار کرنے میں مصروف تھا۔ سبھی امجد سے مشورہ لیتے۔ کون سی کتاب دیکھیں۔ کونسا رسالہ ممد ثابت ہو سکتا ہے۔ امجد یوں تو سبھی کو جواب دیتا تھا۔ لیکن سکینہ کے سوالات کا جواب وہ بڑی سنجیدگی سے دیتا تھا۔ کوئی شفیق پروفیسر بھی اسطرح اپنے سارے تجربات اپنے سٹوڈنٹ کے سامنے نہیں رکھتا۔ جس طرح وہ سکینہ کے سامنے اپنا ذہن کھول کے رکھ دیتا تھا۔ امجد دل سے چاہتا تھا۔ کہ سکینہ فسٹ ڈویژن لے لے۔ امتحان کی تیاری کے لئے چھٹیاں ہو گئیں۔ مگر پھر بھی لائبریری اور سیمینار میں یہ لوگ ملتے ہی تھے۔ اس دوران امجد اور سکینہ اور قریب

ہو گئے۔ امجد کئی دفعہ اُس کے گھر بھی گیا۔

پرچے تین دن کے بعد شروع ہونے تھے۔ یہ سب ہال ٹکٹ لینے کیلئے ڈیپارٹمنٹ میں آگئے تھے۔ کہ سکینہ نے امجد سے بات چیت کے دَوران کہا۔ "میں نے انٹرنیشنل تھاٹ، پر کچھ نہیں لکھا ہے۔ نہ ہی میرے پاس کتاب ہے۔ آپ کچھ مدد کرینگے۔ تو بیحد ممنون رہونگی۔"

امجد نے کچھ نوٹ اس پر بنائے تو تھے۔ مگر کتاب اس کے پاس بھی نہ تھی۔ اور اس پرچے میں صرف کچھ دن باقی رہ گئے تھے۔ اور انٹرنیشنل تھاٹ کے پورے ساٹھ نمبر تھے۔ لیکن سکینہ کا سڈول چہرہ اُس کے سامنے تھا۔ اُس کی موٹی موٹی آنکھیں اس کو گھور رہی تھیں۔ وہ سراپا پیکر عجز و نیاز بنکر اس کی طرف پُر امید نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ امجد کی عقل اور اُس کے دل میں ٹگ آف وار چلنے لگی۔ کئی دفعہ عقل نے لپک کر اُس کے دل کو سکینہ کے قریب ہوتے ہوئے واپس کھینچ لیا۔ مگر اس کشمکش میں آخر دل کی جیت ہو گئی۔ اور دوسرے دن انٹرنیشنل تھاٹ پر تیار کئے ہوئے نوٹ اُس نے سکینہ کو دے دئیے۔ وہ اس سے اتنا بھی نہ کہہ سکا۔ کہ تم میرا سب کچھ لے رہی ہو۔ میرا کیریر اسی میں ہے آخر کہتا بھی

کیسے جبکہ اس کے سامنے سکینہ کی کامیابی اس کی اپنی کامیابی تھی۔ دو برس ساتھ رہ کے وہ سکینہ کے اتنا قریب ہو گیا تھا۔ کہ واپس لوٹنا امکان سے باہر تھا۔ امتحان شروع ہو گیا۔ انٹرنیشنل تھاٹ والے پرچے سے پہلے امجد نے لائبریری سے کتاب حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر امتحان کے زمانے میں تو نصاب کی کتاب عنقا ہو جاتی ہے۔ نام سب دہراتے ہیں۔ مگر تاجروں کے اصلی کھاتے کی طرح نظروں سے اوجھل ہی رہتی ہے۔ سال بھر کی جمع کی ہوئی انفارمیشن کو گھنٹوں میں ریوائز کیا جا سکتا ہے امجد بھی ایک ذہین طالب علم تھا۔ وہ بھی ایسا کرتا۔ لیکن جو باتیں سال بھر بڑی محنت سے جمع کی تھیں۔ وہ تو اس نے اپنی چہیتی سکینہ کی نذر کر دی تھیں۔ اس کے پاس اب کیا تھا۔ جسے ریوائز کرتا۔

امتحانات ہو گئے۔ اب سکینہ امجد سے نہیں ملتی تھی۔ امجد اس کے گھر جاتا۔ مگر بہانہ کوئی نہیں تھا۔ دن گذرتے گئے۔ یہاں تک کہ رزلٹ کا دن آ گیا۔ وکٹوریہ گیٹ کے اندر۔ رجسٹری کے کمپاونڈ میں نوٹس بورڈ کے سامنے بھیڑ تھی۔ امجد بھی کسی طرح سامنے پہنچ گیا۔ چند لمحوں تک نظریں دوڑانے کے بعد ہی اس کی نظر سکینہ کے نام پر پڑی۔ جس نے

یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے باہر آگیا۔ اُسے اتنا بھی ہوش نہیں رہا۔ کہ اپنا رزلٹ دیکھتا۔ سٹوڈنٹ اسے مبارکباد دے رہے تھے۔ اور وہ مسکرا مسکرا کے سبوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا تھا۔ اپنے دل میں وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے اُسے خود ہی فسٹ پوزیشن ملی ہو۔ پولٹیکل سائینس کا سٹوڈنٹ ہو کر بھی وہ فلسفیوں کی طرح ایک لغلاتہ احساس سے خوشی محسوس کر رہا تھا۔

امجد کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ اُسے سکینہ کی تلاش تھی وہ کچھ آگے بڑھا۔ ایس ایس ہال کے سامنے لڑکوں اور لڑکیوں کی بھیڑ تھی۔ اس کے قدم اسطرف کو اٹھے۔ اور وہ یہ دیکھ کر پھولے نہیں سمایا۔ کہ اُسکی سکینہ وہیں تھی۔ خوشی سے اُس کا انگ انگ ایک ہنستا ہوا گلستان لگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے پھوٹنے والی خوشی کی لہریں فضا میں بکھر رہی تھیں۔ جنت کا سماں تھا۔ جہاں کوئی غم نہیں۔ صرف خوشی ہی خوشی ہے وہ پھول مالاؤں میں لدی ہوئی ایک آسمانی حور لگ رہی تھی۔ تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی ہر دل کو للچا رہی تھی۔ اور خود شانِ بے نیازی کی اُن لہروں پر سوار تھی۔ جو دلوں کے سفینے پاش پاش کرتی ہوئی آگے ہی

رہتی ہیں۔ امجد بھی بھیڑ کو چیر کر قریب پہنچا۔ اس کے ہونٹ تھرتھرانے لگے۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ سکینہ کو بڑھ کے ہاتھوں میں لے لے۔ اور اس خوشی کے موقعے پر اسے بھینچ بھینچ کے پیار کر لے۔ مگر جذبات نے اس کو اسقدر مغلوب کر دیا۔ کہ زبان بھی لڑکھڑانے لگی۔ بڑی مشکل سے وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ "مبارک ہو"۔ اور اس مختصر سے جملے میں اس کے ارمانوں کی ایک طویل داستان تھی۔ لیکن جب اُسے وہاں سے ہی عام جواب ملا۔ جو وہ سب کلاس فیلوز کو دے رہی تھی۔ تو وہ بھونچکا رہ گیا عقل کو وار کرنے کا موقعہ مل گیا۔ مگر دل بچاؤ سے کب چوکتا ہے۔ اس کا دل اُسے سمجھانے لگا۔ کہ دل کی باتیں بھری بزم میں نہیں سنائی جاتیں۔ بھیڑ کو ختم ہو جانے دو۔ ابھی تمہارا شکریہ ادا کرے گی۔ اپنے ساتھ گھر لے جائیگی۔ سبھوں سے کہہ دیگی۔ کہ مبارکباد کے مستحق تو یہ ہیں۔ امجد کا دل اسکو یہی فریب دیتا رہا۔ اور سکینہ آگے ہی بڑھتی۔ امجد کے خواب اُسے کبھی ایک رخ اور کبھی دوسرا رخ دکھا رہے تھے۔ اور اُس کے دل کا سفینہ ہچکولے کھا رہا تھا۔ اُسے اس کا بھی ہوش نہ رہا۔ کہ اب کمپاؤنڈ میں کوئی نہیں ہے۔

وہ اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ کہ بوڑھے چوکیدار برکت نے اُس کو چونکا دیا۔ وہ اسے مایوس دیکھکر کہہ رہا تھا۔ "امجد میاں! آپ فیل ہو گئے"۔ امجد کے ہونٹوں پہ ایک خفیف سی مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اور غیر شعوری طور پر اُس کی زبان سے نکلا۔ "ہاں برکت بھائی میں فیل ہو گیا"۔

اس پر برکت نے کہا۔ "بیٹا امتحان میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی فیل، کوئی پاس اسی لئے میں رزلٹ کے دن سے گھبراتا ہوں۔ جو سال بھر ہنستے ہوئے پھول لگتے ہیں۔ وہ ایکدم مرجھا جاتے ہیں۔ کتنا ظلم ہے یہ۔ میں بے چین ہو جاتا ہوں"۔

امجد نے اُداس لہجے میں جواب دیا۔ "برکت بھائی! سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ کسی کے منہ سے نوالہ چھین کر دوسرے کے منہ میں ڈالدیتا ہے اس کے کھیل ایسے ہی ہیں"۔ پھر جیسے کچھ یاد آجاتا ہے۔ اور کہتا ہے "برکت بھائی! اب میں جا رہا ہوں۔ خدا حافظ!"

برکت۔ "جاؤ خدا تمہیں صبر جمیل عطا کرے۔ خدا حافظ"۔

امجد نے پاس ہی زینہ کے ساتھ کھڑی سائیکل لے لی۔ اور سر سید ہال سے گذر کر دائیں طرف موہسن کورٹ اور آزاد لائبریری کے

بیچ والی سڑک پر ہو لیا۔ موڑ پر آگر وہ غیر شعوری طور پر دائیں طرف کو گھوما۔ اور لال ڈگی کی طرف ہو لیا۔ سکینہ اپنے چچا ڈاکٹر محبوب الحسن کے یہاں رہ رہی تھی۔ امجد دل میں یہ خیال لئے تھا۔ کہ شاید سہیلیوں کی وجہ سے اُسے امجد سے ملنے کا وقت نہ ملا ہو۔ یا خوشی کی خبر سنانے کیلئے جلدی گھر جانا ضروری خیال کیا ہو۔ آخر ایک لڑکی ہی تو ہے۔ کب تک برداشت کر سکتی تھی۔ یہی سوچتے ہوئے وہ محبوب منزل کے کمپونڈ میں پہنچ گیا۔ یہاں اُسے ایسا لگا۔ کہ محبوب منزل کی دیواریں تک مسرور ہیں۔ پر وہ تو وہاں ہوتا نہیں تھا۔ پہلے بھی کئی دفعہ آچکا تھا۔ وہ سیدھا اندر گیا۔ محبوب الحسن ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے تھے۔ اُن کے چہرے پر گہرے تفکر کے آثار موجود تھے۔ پھر بھی امجد کو دیکھتے ہی اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے مبارکباد دی۔ سکینہ کو بلوایا گیا مگر اندر آتے ہی جب اُس نے امجد کو دیکھا۔ تو کھلا ہوا چہرہ سنجیدہ ہو گیا۔ اور امجد کی مبارکباد کے جواب میں اُس نے کہا "میں یونیورسٹی میں آپ سے مل چکی ہوں۔ آپ شاید بھول گئے" محبوب الحسن جہاندیدہ انسان تھے۔ فوراً مداخلت کرتے ہوئے کہا "بیٹی وہاں کی بات اور ہے۔

یہاں کی اور ۔۔ سامنے تو سبھی خوشامد کرتے ہیں۔ مگر وہ یہاں نہیں آتے
پھر امجد کی طرف دیکھکر کہا ۔۔

"بیٹا تم کس ڈیوژن میں پاس ہو گئے" ۔ اب امجد کو خیال آیا ۔
کہ اس نے اپنا رزلٹ دیکھا ہی نہیں ہے ۔ وہ سوچ ہی رہا تھا ۔ کہ کیا جواب
دے ۔ کہ سکینہ بول پڑی ۔۔۔ سیکنڈ ڈیوژن میں پاس ہوئے ہیں"
انہوں نے امجد سے مخاطب ہو کر کہا ۔ "مبارک ہو بیٹا! مبارک ہو" ۔ پھر
سکینہ سے کہا ۔ بیٹی! جاؤ ۔ ان کے لئے چائے تو بنا لاؤ" ۔۔ اس پر
سکینہ نے بیدلی سے سر تھام کر کہا ۔ "سر میں کچھ درد ہے ۔ میں تھوڑی دیر
آرام کرنا چاہتی ہوں ۔ اچھا بھیجدیتی ہوں" ۔ یہ کہکر وہ اندر چلی گئی ۔
امجد کا ذہن قلابازیاں کھا رہا تھا ۔ مگر کیا کرتا ؏
ہمیں عشق میں ہیر جیب لگ گئی ہے ۔ کے مصداق خاموش رہا
محبوب الحسن اس سے کہہ رہا تھا ۔ " بیٹا تم اتنے مایوس کیوں ہو ۔
امتحان میں ہوتا ہی ایسا ہے ۔ سیکنڈ ڈویژن بھی اچھا ڈویژن ہے ۔
اپنے سے کم نمبر والوں کی طرف دیکھو" ۔
امجد کے ہونٹوں پہ ایک بے جان سی مسکراہٹ ظاہر ہوئی ۔ اور اس نے

کہا۔"جی میں مایوس نہیں ہوں۔ دراصل میں اپنی کامیابی سے بہت زیادہ خوش ہوا ہوں۔ اسی لئے بوکھلایا سا ہوں" امجد اس سے کیا کہتا۔ کہ میں فیل ہو گیا ہوں۔ میرا سکنڈ ڈویژن بے معنی ہے۔ جس کے لئے اپنا مستقبل داؤ پر لگایا تھا۔ وہی بیگانہ نکلا۔ وہ یہاں سے اٹھ کے جانا چاہتا تھا۔ مگر اس کی زبان جواب دے چکی تھی۔ وہ اجازت نہیں مانگ سکتا تھا۔ اس کے پاؤں اٹھنے سے معذور تھے۔

اتنی دیر میں چائے آگئی۔ اور نوکر چائے بنانے لگا۔ محبوب الحسن نے چائے کی پیالی امجد کی طرف بڑھاتے ہوئے (جو اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی لے لی) کہا۔

"بیٹا! سکینہ کی باتوں کا برا مت ماننا واقعی اس کے سر میں درد ہوگا ابھی ابھی وہ ایک بہت بڑا فیصلہ کر چکی ہے" امجد کو خیال ہوا۔ کہ ریسیرچ کرنے کی بات ہو گی یا ملازمت کی۔ پھر بھی اس نے پوچھ ہی لیا۔ کونسا فیصلہ؟ محبوب الحسن نے غمگین لہجے میں کہا۔

"اپنی زندگی کا فیصلہ۔ شادی کے شادی۔ یہ ابھی یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ بھائی صاحب نے پچھلے مہینے کئی خط بھیجے تھے۔ کہ اس سے شادی

بارے میں بتانے لیجائے۔ کچھ فوٹو بھی بھیجے تھے۔ اور سکینہ نے کہا تھا۔ کہ رزلٹ جس دن آوٹ ہوگا۔ اسی دن میں فیصلہ سناؤنگی۔ مگر ایک عجیب بات ہوگئی جس کا میں خیال بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

امجد کو امید کی ایک کرن سی نظر آنے لگی۔ اُسے خیال ہوا۔ شاید سکینہ نے سبھوں کو ٹھکرا کر میرے بارے میں کہا ہوگا۔ اور نسوانی حیا کے باعث وہ یہاں سے بہانہ بنا کے چلی گئی۔ چائے بھی خود نہیں لائی۔ اُس نے اشتیاق آمیز لہجے میں پوچھا۔

"بات کیا ہوئی۔ آپ کچھ پریشان سے ہیں۔"

مجیب الحسن۔ "بھئی کیا بتاؤں۔ اُن میں ایک تصویر ایک بدصورت آدمی کی بھی، جو بھائی صاحب کو ہرگز پسند نہیں۔ پہلے ہی ایک بیوی کے چار بچے اُس کے گھر میں ہیں۔ مگر ایک مل اونر ہے اور دولت کے نشے میں اُسے عمر کا بھی امتیاز نہیں۔ کوئی چالیس کے لگ بھگ ہوگا۔ بیوی کے مرے ہوئے چھ مہینے ہوگئے ہیں۔ بھائی صاحب نے تو صرف جتانے کے لئے اُس کے بارے میں لکھا تھا۔ ورنہ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے۔ کہ ایسا شخص اُن کا داماد بنے۔ پتہ نہیں اسے کیا ہوا کتنے ہی لیکچر دل نے

خواستگاری کی ہے۔ ایک تو ریڈر بھی ہے۔ مگر حسن نے نہ جانے اس مل اونر کی کس بات کو پسند کیا۔"

امجد کے پاؤں تلے زمین نکل گئی۔ مگر اپنے آپ کو سنبھالا رہا۔ آخر ایم۔اے پاس تھا۔ وہ بھی سیاسیات میں ہمت کر کے اس نے پوچھ ہی لیا۔ "آپ نے نہیں سمجھایا۔"

محبوب الحسن نے کہا۔ "میں نے تو کہا تھا۔ کہ یہ رشتہ ہرگز موزوں نہیں۔ مگر اس نے ایسا لیکچر دیا۔ کہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے اپنی یادداشت پر شک ہونے لگا۔ کہ اس نے معاشیات میں ڈگری نہیں لی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آتا۔ کہ وہ آج اتنی کیسے بدل گئی۔ شاید عام لڑکیوں کی طرح دولت کی بھوکی ہو گئی ہے۔ جبکہ بھائی صاحب کے پاس کوئی کمی نہیں۔"

امجد کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اور کہا۔ "جی نہیں، ایسا ایسا تو خاص لڑکیاں ہی کرتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی ممکن ہے۔ کہ اسے کوئی بھی پسند نہ ہو۔ اور اس نے رد کرنے کا یہ بہانہ ڈھونڈا ہو"

محبوب الحسن نے جواب دیا۔ "ارے میاں! میں نے کہہ دیا تھا کہ نہ ضرور نہیں۔ انہی میں سے کسی کو چن لینا۔ اور رشتے آئیں گے۔ مگر وہ تو مصر ہے

کہ شادی ہوگی۔ تو اُن ہی مہاشے سے میں پریشان ہوں۔ کہ بھائی صاحب کو کیا جواب دوں؟"

امجد کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے اُس کی بدن میں جان ہی نہیں۔ اپنی ساری قوت کو مجتمع کر کے بدقت تمام اُس کی زبان سے نکلا۔ "جی شادی میں جبر نہیں۔ اُنکی مرضی ہے۔ تو لکھ دیجئے۔ بھائی صاحب کو۔ اور میری طرف سے بھی مبارکباد قبول کیجئے"۔ اس دوران چائے کی پیالی ختم ہو گئی تھی۔ امجد نے پیالی میز پر رکھکر اجازت لے لی۔ اور باہر آیا۔

رات ہو گئی تھی۔ امجد کے دل کی دنیا میں شاید اب کبھی سویرا آنیوالا نہیں تھا۔ اس رات میں اجالا ڈھونڈھنے والے فلسفی تو ہو سکتے ہیں۔ مگر امجد جیسا محبت کرنیوالا نوجوان فلاسفر نہیں ہوسکتا تھا اس رات کے بعد سویرے نے بھی امجد کو نہیں دیکھا۔ چند دن میں یہ بات یونیورسٹی میں آگئی۔ سبوں کی نظریں امجد کی تلاش کر رہی تھیں لیکن اُس کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ امجد سچ مچ فیل ہو گیا تھا۔ زندگی کے امتحان میں دل کے امتحان میں۔ عقل کا سہارا بھی اس سے چھن گیا تھا۔ اور سکینہ ٹاپ کر گئی تھی۔ زندگی کے امتحان میں بھی اور عقل کے

امتحان میں بھی۔ دل تو ایک کھلونا ہے۔ اس سے کئی طریقوں سے کھیلا
جا سکتا تھا۔ موٹروں کی رفتار تو بہر حال دل کی دھڑکن سے تیز ہوتی
ہے۔ دھڑکن تو پریشان کرتی ہیں۔ مگر سکوں کی کھنکھناہٹ ہمیشہ
نقرئی قہقہوں کی طرح خوش کُن ہوتی ہے۔

# اور وہ ٹاپ کر گئی۔

حسب معمول انور آج بھی تھکا ماندہ گھر پہنچا۔ بغل میں فائیں دبائے
اُس نے جونہی دروازے کے اندر قدم رکھا۔ اُس کی ماں نے مسکراتے
ہوئے اُس کا خوش آمدید کیا۔ انور جانتا تھا۔ کہ اُس کی ماں کی مسکراہٹ
مصنوعی ہے۔ وہ دل پر جبر کر کے ہنستی ہے۔ مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا
اُس نے اپنی ماں کو ایک نظر دیکھا۔ اور اندر چلا گیا۔ جہاں اُس کی
دو بہنیں موجود تھیں۔ جو اس بات کی منتظر تھیں۔ کہ بھیا۔ آج
اُنہیں خوشخبری سنائیگا۔ مگر انور کا لٹکا ہوا چہرہ ہی اُن
ہر خواہش کا جواب تھا۔ انور نے فائیں ایک طرف رکھا۔ اور چارپائی پر
دراز ہو گیا۔

انور کی آنکھیں بند تھیں۔ مگر اُس کے ذہن میں مختلف دفتروں
اور افسروں کی تصویریں یکے بعد دیگرے پھر رہی تھیں۔ کہ اُس کے
کانوں میں ماں کی آواز پڑی۔

"انور! اٹھو چائے پیو۔"

اُس نے آنکھیں کھولیں۔ اور سیدھا بیٹھکر چائے کی پیالی ہاتھ میں لیکر کچھ سوچنے لگا۔ ماں نے پیار بھرے لہجہ میں کہا۔

"بیٹے تم پریشان کیوں ہو۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہوگا۔ انسان کے ہاتھ میں صرف کوشش ہے۔ سو وہ تم کر رہے ہو۔"

پھر ایک لمحہ کے توقف کے بعد اُس نے چائے کی پیالی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔"

انور نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا۔

"ماں! اب میں تنگ آگیا ہوں۔ کل سے میں یہ فائل اپنے ساتھ نہیں اُٹھاؤنگا۔ میں تھک گیا ہوں۔ یہ بوجھ اُٹھاتے اُٹھاتے کبھی سوچتا ہوں۔ اتنا وقت یہ سرٹیفکیٹ حاصل کرنے میں ضایع ہی کیوں کیا تھا۔"

اکبری بیگم ایک سیشن جج کی بیوی رہ چکی تھی۔ وہ اپنے بیٹے کے ان سرٹیفکیٹوں کی قیمت جانتی تھی۔ اُس کے سامنے اسوقت اپنے مرحوم

شوہر کی تصویر پر پھرنے لگی۔ جو انور کو ایک کامیاب جج بنانے کی فکر میں تھا۔ یہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔ "کاش آج وہ زندہ ہوتے! اپنے بیٹے کا کمال دیکھکر پھولے نہ سماتے۔ ایم۔اے فسٹ ڈویژن میں پاس کر لیا۔ کالج اور یونیورسٹی سے کئی میرٹ سرٹیفکیٹ حاصل کئے۔ مگر اسی کے لئے روٹیاں اتنی مہنگی ہو گئیں۔ کہ ان سرٹیفکیٹوں سے بھی بیزار ہو چلا ہے۔ ایک طرف جو ان بہنوں کا غم کھائے جا رہا ہے دوسری طرف سماج کی بڑھتی ہوئی رسمیں، دنیا داری کا غم اور سب سے بڑھکر اپنے بیکار بیٹھے رہنے کا الم۔

اکبری بیگم کے سامنے وہ زمانہ آگیا۔ جب اس کے پاس بڑے بڑے رئیسوں کی بیویاں نذرانے لیکر آتیں۔ اور وہ یہ کہکر لوٹا دیتیں۔ کہ جج صاحب ناراض ہونگے۔ جب وہ ضد کرتیں۔ تو یہ کہدیتیں کہ کچہری بھجوا دیجئے ہر ایک ادب کرتا۔ حکومت کو اُن کی صلاحیتوں پر ناز تھا۔ ہر محفل کی شمع بنے رہتے تھے۔ اُن کی موت پر منظور کی گئی قرار دادوں کا پلندہ اب بھی اُن کی میز پر رکھا تھا۔ اُن تعزیتی قرار دادوں کی رو سے سب امیر اور وزیر اُن کے غم میں شریک تھے۔ مگر اب اس کنبے کا کوئی غمخوار نہیں تھا۔

انور ایک معمولی سی نوکری کے لئے ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ اکبری بیگم کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ انور نے جونہی اپنی ماں کو روتے دیکھا۔ تو تلملا اٹھا وہ ماں کے آنسو پونچھتے ہوئے کہنے لگا۔

"ماں! تمہارے آنسو بہت قیمتی ہیں۔ انہیں اسطرح مت بہاؤ ساری دنیا کی خوشیاں بھی تمہارے آنسوؤں کا بدل نہیں ہو سکتیں کاش یہ ظالم زمانہ ماں کے آنسوؤں کی قیمت جان سکتا۔"

اکبری بیگم نے محسوس کیا۔ کہ انور اب رونے کو ہے چائے بھی اُس نے نہیں پی۔ اس لئے آنسو روکتے ہوئے بولی۔

"بیٹا! تم نے ابھی تک چائے نہیں پی؟ اچھا رکھ دو اسے۔ میں نئی بنواتی ہوں۔ ٹھنڈی ہو گئی ہے۔" پھر سلیمہ کو آواز دی۔ "سلیمہ سلیمہ" "آئی ماں" کہتے ہوئے اندر آگئی۔ ماں بیٹے کے اُترے ہوئے چہرے دیکھکر اُس کو دھچکا سا لگا۔ بالغ لڑکی۔ پڑھی لکھی اور عقل و شعور میں پختہ، ہر بات کو محسوس کرنے والی۔ مگر۔ . . . اس سے پہلے کہ وہ اس ماحول میں ڈوب جاتی۔ ماں نے کہا۔

"بھیا کے لئے گرم چائے بنا کے لے آؤ۔"

سلیمہ پیالی لے کر چلی گئی۔ تو اکبری بیگم نے بیٹے سے پوچھا۔
"بیٹا! آج تو تمہارا پھر کہیں انٹرویو تھا۔ اور تم تو کہہ رہے تھے
کہ امیدواروں میں تمہارے بغیر کوئی ایم۔اے پاس نہیں ہے۔ پھر اتنے
مایوس کیوں ہو؟"

اس نے غمگین لہجے میں جواب دیا۔

"ماں! کیا بتاؤں۔ انٹرویو میں تو میں نے اچھا کیا تھا۔ مگر وہ جو
بورڈ کے چیئرمین ہیں۔ انہوں نے کہدیا۔ کہ وہ پوسٹ میرے لائق نہیں۔
اس لئے کہ میں ایم۔اے پاس ہوں۔ میں نے کہدیا۔ کہ میں تو پوسٹ کے
لائق ہوں۔ بیکاری سے تنگ آگیا ہوں۔ جو بھی کام ہوگا۔ کر دونگا مگر"

ماں بولی ــــ "مگر کیا؟ اس نے کیا کہا؟"

"تمہیں دس کام مل سکتے ہیں۔ لیکن خالی گریجویٹ کہاں جائیں گے
ایک کلرک کی جگہ تو گریجویٹ کو ہی ملنی چاہیئے۔ میں نے بہت عاجزی کی۔
مگر انہوں نے مجھے خود غرض کہدیا۔" تھوڑی دیر رک کر انور نے ایک آہ
بھرتے ہوئے کہا۔

"سوچتا ہوں۔ میں نے ایم۔اے کا سرٹیفکیٹ دکھایا ہی کیوں تھا؟"

یہ سنکر ماں نے کہا۔

"بیٹا! بھولے مت ہنو۔ اگر تم نے کہا ہوتا۔ کہ میں صرف بی اے ہوں۔ جب بھی کچھ نہ کچھ کہکر ٹال دیتے۔ خیر اللہ پہ بھروسہ رکھو۔"

اسی وقت سلیمہ چائے لیکر اندر آگئی۔ انور نے چائے کی پیالی لی۔ اور پینے لگا۔ سلیمہ ایکطرف بیٹھکر ماں کے اُترے ہوئے چہرے کو تکنے لگی۔ اسے خیال آیا۔ کہ اباجان کی وفات سے پہلے وہ کتنی خوش رہتی تھی۔ اُس کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ اور تھوڑی دیر کے لئے یہ اُترا ہوا چہرہ اُس کی نظروں سے بالکل اوجھل ہوگیا۔ اب اُس کے سامنے وہ اکبری بیگم کھڑی تھیں۔ جو جسٹس فضل الحسن بار ایٹ لا کی بیوی تھیں۔ ہاتھ ہلا ہلا کر کے نوکروں کو حکم دے رہی تھیں۔ کتنی ہی تصویریں اس کے سامنے آگئیں۔ مگر آخر حقیقت حال سے کب تک غافل رہتی۔ خیالات کی بھول بھلیوں سے نکلکر اُسے یقین کرنا ہی پڑا۔ کہ اس کی ماں اب فضل الحسن کی بیوہ ہے بیوی نہیں۔ افلاس نے اُس کی سلیقہ شعاری اور عالی ظرفی پر اپنا ملمع چڑھایا ہے۔ اگرچہ وہ اب بھی وہی اکبری بیگم تھی۔ مگر لوگ

اُسے اب ویسا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ اپنے بچوں کی نظر میں بھی وہ، وہ نہ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اسکی اپنی نظریں بھی کبھی کبھی اُسے دھوکہ دیتی تھیں۔

تینوں اپنے اپنے خیالات میں کھوئے ہوئے تھے کہ فہمیدہ کے اندر آنے نے سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ انور نے چائے کی پیالی رکھتے ہوئے فہمیدہ سے پوچھا۔

"فہمیدہ! تمہاری فیس کا کیا ہوا؟"

فہمیدہ نے روہانسی آواز میں جواب دیا۔

"بھائی جان! پرنسپل نے کہا۔ کہ کالج کی فیس تو ہم نے معاف کر ہی دی۔ مگر یونیورسٹی کی فیس تمہیں دینا ہی پڑیگی۔ میں نے تو منت سماجت کی تھی۔ لیکن اُنہوں نے اپنی مجبوری جتائی۔ پرسوں فیس داخل کرنے کی آخری تاریخ ہے۔ اب میں کیا کروں" اتنا کہکر فہمیدہ کی موٹی موٹی آنکھیں بھر آئیں۔

انور کے لئے یہ سب ناقابل برداشت تھا۔ مگر وہ کیا کرتا۔ پورے پچھتر روپے اُسے کہاں سے ملتے۔ اُس کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

نہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا۔ کہ فہمیدہ امتحان نہ دے۔ مگر مجبور تھا۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا۔ کہ اکبری بیگم نے اُس کے خیالات کا سلسلہ منقطع کر دیا اور فہمیدہ سے کہا۔

"جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ کل تک دیکھا جائیگا۔ اور سلیمہ تم جا کے رسوئی میں دیکھو۔ کوئی کام تو نہیں؟"

دونوں بہنیں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں تو وہ انور سے مخاطب ہوئی۔

"بیٹا! فہمیدہ رو رو کے برا حال کرے گی۔ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارے امتحان کی فیس تو میں نے چوڑیاں بیچکر داخل کر دی تھی۔ باقی زیورات تو ایک ایک کر کے پہلے ہی بک چکے تھے۔ گھر میں اب رکھا ہی کیا ہے۔ اور جو کچھ ہے۔ اُسے بیچکر کیا ملیگا؟ میں تو بیحد پریشان ہوں۔ بیچاری نے بہت محنت کی ہے۔ کہاں ٹاپ کرنے کے خواب دیکھتی تھی۔ کہتی تھی۔ بھائی جان سے زیادہ نمبر لونگی۔ اور کہاں اب . . . . .

انور کو اس بات پہ خیال آیا۔ کہ بی۔ اے میں ٹاپ کر کے اُس نے گولڈ میڈل انعام میں پایا تھا۔ کیوں نہ اُسے بیچ ڈالے۔ اس خیال کے

ذہن میں آتے ہی ماضی کے کتنے سین اُس کے سامنے آگئے۔ تقسیم اسناد کے جلسے کا وہ منظر جس میں ایران کے سفیر نے انور کو وہ میڈل دیا تھا۔ اُس کے ذہن میں تازہ ہو گیا۔

اکبری بیگم نے نہ جانے کیا کیا کہہ ڈالا۔ مگر اُس نے جلدی محسوس کیا۔ کہ انور اپنے خیالوں میں کھو گیا ہے۔ اُس نے انور کو خیالوں کی دنیا سے یہ کہہ کر نکال دیا۔

"بیٹا! کیا سوچ رہے ہو؟"

انور نے ماں سے میڈل کی بات کہہ دینا مناسب نہ جانا۔ اُسے یقین تھا۔ کہ اُس کی ماں بیٹی کا امتحان نہ دینا منظور کرے گی۔ لیکن میڈل بیچنے پر رضامند نہ ہو گی۔ وہ بیٹے پر اتنا ظلم نہ کرتی۔ اسلیے اُس نے کہدیا

"ماں! میں اپنے ایک دوست سے پیسے لے لونگا۔ وہ ایسا نہیں۔ کہ بُرا مانے۔ بعد میں لوٹا دینگے۔ آخر ایک نہ ایک دن کام تو مل ہی جائیگا اور صرف یہی ایک راستہ ہے۔ فہمیدہ کی فیس داخل کرنیکا۔"

یہ سنکر ماں نے کہا۔

"بیٹا! کسی اور کام کے لئے روپے کی ضرورت ہوتی۔ تو شاید میں

تم کو ایسا کرنے کا مشورہ نہ دیتی۔ مگر فہمیدہ کی محنت اور اُس کا ٹاپ کرنے کا ارمان مجھے ڈگمگا رہا ہے۔ اگر وہ فارم نہ بھر سکی۔ تو جان ہی دیدے گی"۔

انور نے کہا۔ "ہاں! تم فکر مت کرو"۔

دوسرے دن انور نے گولڈ میڈل گھر سے جاتے وقت اپنی جیب میں رکھ لیا۔ راستے میں ایک صراف کی دوکان پر اسے بیچنے کے لئے گیا۔ صراف نے پہلے میڈل کو اپنی کسوٹی پر پرکھا۔ پھر پرکھنے کے بعد پچاس روپے قیمت بتا دی۔ انور جانتا تھا۔ کہ یہ ڈھائی سو روپے کی مالیت کا میڈل ہے۔ اُس نے اس سے کہدیا۔ اس کی قیمت تو اس سے کئی گنا زیادہ ہے"۔ اس پر صراف نے کہا۔

"ہاں ہے تو لیکن . . . چوری کے مال کی قیمت اسی حساب سے ملتی ہے"۔

انور یہ الفاظ سنکر سٹپٹا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ کہ دنیا میں سب سے مشکل کام یہ ثابت کرنا ہے۔ کہ میں، میں ہوں۔ انور کو جب یہ انعام ملا تھا۔ اُسوقت پندرہ ہزار طلبا میں سے کم از کم تین ہزار طلبا کے دل میں

اس میڈل کا لالچ ہوا ہوگا۔ مگر کسی کو زبان سے یہ کہنے کی ہمت
کیسے ہوتی۔ کہ انور کو یہ اعزاز ناحق ملا۔ دوکاندار سے میڈل واپس لیکر
اُس نے جیب میں رکھ لیا۔ اور اُن دفتروں کی طرف چلا۔ جن کے چکر وہ
بارہا لگا چکا تھا۔ کسی جگہ ایک موہوم سی امید بندھ جاتی۔ تو دوسری
جگہ کا کورا جواب اُس کی ہمت کو چیلینج کرتا۔ کوئی کہتا۔ کہ ہمیں معمولی
پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت ہے۔ اور کوئی کہتا۔ آج کے فسٹ ڈویژن
تو نقل کا کرشمہ ہیں۔ انور کہیں علامت استفہام بن جاتا۔ اور کہیں
جذبات میں آکر آمادۂ فساد ہو جاتا۔ مگر اپنی بے مائگی اور مجبوری اس کے
جوش کو ٹھنڈا کر دیتی۔ اور اُس کے ذہن میں اُبھرنے والے ہر سوال کا جواب
اُس کی اپنی لاچاری بن جاتی۔

ادھر انور کے گھر سے جانے کے بعد اکبری بیگم نے فہمیدہ سے کہا تھا
کہ آج اُس کا بھائی جان پیسے لے آئیگا۔ اور اُس کی فیس داخل کی جائیگی۔
اِس لئے وہ شام کو انور کی منتظر تھی۔ مگر انور جب خالی ہاتھ لوٹا تو اُس کی
اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ مایوس ہو کر خاموش ہو گئی۔ کسی سے کوئی
بات نہیں کی۔ جب انور نے اسے کہدیا۔ کہ کل وہ پیسے لے کر اُس کے

کالج آئیگا۔ پھر بھی وہ خاموش رہی۔

دوسرے دن انور میڈل کے ساتھ سرٹیفکیٹ بھی ثبوت کے طور پر ساتھ لے گیا۔ صراف کو فخر سے دکھایا۔ اسوقت اُسے پیسوں سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی۔ کہ وہ اپنے کل کے گفتار پر شرمندہ ہوگا۔ اُسے اِس بات کا علم نہ تھا کہ پیسے والے تو کنول کے پھول ہیں۔ وہ شرم کے پانی میں کتنے ہی غوطے کھائیں۔ مگر بھیگنے نہیں پاتے۔ انور نے پیسے لے لئے میڈل کے ہاتھ سے جانیکا بہت غم ہوا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا

وہ مرد تھا۔ اسکی رگوں میں ایک کامیاب بیرسٹر کا خون دوڑ رہا تھا ذہن میں وہ کتابی تجربات تھے۔ جو ایم اے تک کی نصابی کتابوں نے اسکو دئے تھے۔ پھر بھی اُن کے لئے اس حقیقت کا سامنا کرنا آسان نہ تھا۔ لیکن فہمیدہ کی خوشی کے خیال نے اُس کو اپنے آپکو سنبھالنے میں کافی مدد دی۔ اور وہ جلدی جلدی فہمیدہ کے کالج کی طرف چل پڑا ٥

فہمیدہ کالج پہنچی تو دیکھا۔ کہ اُس کی سہیلیاں فارم بھر رہی ہیں صرف ایک وہ ہے۔ جو ابھی تک فیس داخل نہیں کر پائی تھی۔ اُس کے ذہن میں پریشان کن خیالات آتے رہے۔ اور کالج میں اُس کا دل نہیں لگا۔ وہ دوسرے ہی

پیریڈ کے بعد گھر لوٹ آئی۔

فہمیدہ گھر میں داخل ہوئی۔ سلیمہ اسوقت کپڑے دھو رہی تھی۔ اور اکبری بیگم کرسی پر بیٹھی۔ آج کے اخبار میں نوکری کے اشتہارات دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ شاید کسی اچھی نوکری کے اشتہار میں کھو کر وہ اپنے انور کی تصویر دیکھ رہی تھی۔ خلاف معمول فہمیدہ کو جلدی آتے دیکھ کر اس کی یہ عارضی خوشی بھی کافور ہو گئی۔ اس نے فہمیدہ کی طرف جواب طلب نظروں سے دیکھا۔

فہمیدہ نے کہدیا۔ "ماں آج کالج میں میرا دل نہ لگا"۔

اور یہ کہکر اوپر چلی گئی۔

اکبری بیگم اس دل نہ لگنے کی وجہ خوب جانتی تھی۔ مگر کیا کرتی۔

انور نے کالج پہنچکر فہمیدہ کو ڈھونڈا۔ مگر پتہ چلا کہ وہ گھر جا چکی ہے اس نے فیس داخل کردی۔ اور فارم لیکر گھر کی طرف روانہ ہوا۔ وہ اسوقت اپنے آپ کو کافی خوش قسمت سمجھ رہا تھا۔

ادھر فہمیدہ کرسی پر بیٹھی خلاؤں میں کھلی کھلی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ اسکی نظروں کے سامنے وہ راتیں ابھر رہی تھیں۔ جن کی نیندیں اسس نے

امتحان کی تیاری میں حرام کر دی تھیں۔ وہ سوچنے لگی۔ کہ اُس کا ٹاپ کرنے کا ارمان دل ہی میں رہ گیا۔ عام لڑکیوں کی طرح وہ بھی مختلف وہموں میں مبتلا ہو کر بے حال ہونے لگی۔ ایک طرف اپنا مستقبل اور اپنی محنت، دوسری طرف اپنے بھائی جان کی بیکاری اور ماں کی لاچاری اُس کے سامنے آتی۔ اپنے آپ سے کہنے لگی۔ شاید اُن لڑکیوں کی بددعا لگ گئی۔ جن کی کُند ذہنی کا میں مذاق اُڑاتی تھی۔

اچانک اُسے خیال آیا۔ جیسے بی۔ اے کا رزلٹ آؤٹ ہو گیا ہے گزٹ اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اس میں اپنا نام تلاش کر رہی ہے۔ جو کہیں بھی نہیں ہے۔ اُس کی حریف، ساجدہ نے ٹاپ کر لیا ہے ناقابل لڑکیاں پاس ہو گئی ہیں۔ اور اُس کا کہیں پتہ نہیں۔ وہ انتہائی پریشان ہو گئی۔ سر سے پیر تک لرزنے لگی۔ بےاختیار ہو کر اُس کے منہ سے چیخ نکلی۔

"ماں"۔

سلیمہ اور اکبری بیگم نے یہ آواز سُنی۔ اور دوڑتی ہوئی اوپر گئیں دونوں یہ دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔ کہ فہمیدہ فرش پر لوٹ رہی ہے

اور اُس کے منہ سے یہ الفاظ جاری ہیں - کہ ــــ "ہا!" ساجدہ ٹاپ کر گئی
یکایک وہ خاموش ہو گئی - اُس پر تشنج کی سی کیفیت طاری
ہو گئی - منہ سے کف نکلنے لگا - اپنا ایک ہاتھ دل پر رکھتی - اور ایک
آنکھوں پر ــــ اُسکی زبان سے نکلنے لگا -

"ماں! مجھے کیا ہو گیا! مجھے کیا ہو گیا ــــ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا"
سلیمہ اپنے بال نوچنے لگی - اکبری بیگم کی ہمت اور استقلال نے
جواب دے دیا - اُس کی بیٹی ایک کٹی ہوئی شاخ کی طرح گر پڑی تھی - اُس کے
حواس کیونکر بجا رہتے - اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا - البتہ سلیمہ روئے
جا رہی تھی -

فہمیدہ اب بے ہوش ہو چکی تھی - اور منہ سے کف برابر جاری تھا -
ماں بیٹی کا یہ حال دیکھ کر کچھ بھی نہ کر پا رہی تھی -
انور خوشی سے قدم اُٹھاتا ہوا گھر پہنچ گیا - اُس نے فہمیدہ کی تقدیر
بدل دی تھی - مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ــــ

چاک کو تقدیر کے کرنا نہیں ممکن رفو　　سوزن تدبیر گو لاکھوں برس سیتی رہے

آج اُسکی تقدیر نے اُس پر ایسا وار کیا تھا - جس کو وہ کبھی نہیں سمجھ سکتا تھا -

گھر کے اندر داخل ہوتے ہی اُس کے کان میں سلیمہ کے رونے کی آواز آئی۔ وہ دوڑتا ہوا اوپر گیا۔ اور صورت حال دیکھکر گھبرا گیا۔ پھر بھی ہمت کرکے اُس نے کہہ ہی دیا۔

"فہمیدہ! دیکھو میں تمہاری فیس داخل کرا آیا ہوں۔ یہ دیکھو رسید اور فارم" مگر اُس کی بات کا جواب دینے والا وہاں کون تھا۔

ماں کے اشارے پر وہ ڈاکٹر کو بلا لایا ۔۔۔ ڈاکٹر نے فہمیدہ کو دیکھا۔ تو وہ دم توڑ چکی تھی۔ اُس کی تشخیص یہ تھی۔ کہ اُسے شاک shock ہو گیا ہے

سلیمہ رو رو کے جان دے رہی تھی۔ اکبری بیگم نے بھرائی ہوئی آنکھوں سے بیٹے کی طرف دیکھ کر سراپا پیکر یاس و حرماں بنتے ہوئے کہا۔

"بیٹے! کاش تم پہلے آجاتے"۔

"انور نے جواب دیا۔ ماں میں تو پیچھے رہ گیا۔ اور وہ ٹاپ کر گئی۔"

اُس کی ماں یہ سنکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ انور کو کسی نے روتے نہ دیکھا وہ صرف ایک ہی جملہ دہراتا۔

"میں پیچھے رہ گیا۔ اور وہ ٹاپ کر گئی۔"

# اسیرِ وقت

انسان اکثر عجیب عجیب خیالات سے دوچار رہتا ہے۔ مگر زیادہ
دیر تک وہ اپنے ماحول سے دور نہیں رہتا۔ ذہن کہیں بھی چلا جائے۔ مگر
تھوڑی دیر کی سیر کے بعد اپنی اصل کی طرف کسی نہ کسی وجہ سے اسے
لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ لیکن اختر سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا۔ دن بھر کے
کام سے تنگ آگیا اسے شدید احساس ہو رہا تھا۔ کہ اس گھٹن سے فرار
ضروری ہے۔ ہر نیا کام اس کے لئے ایک اور ضرب کا کام کرتا۔ ہر نیا
ملنے والا شخص اسے اپنی باتوں سے بہرا بنانے کا تہیہ کئے ہوئے نظر
آرہا تھا۔ ہر نیا نظارہ اس کی آنکھوں پہ ایک تازہ پردہ چڑھا کر اسکو
بتدریج اندھا کرتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے اصلی دوستوں سے دور ہو رہا
تھا۔ اس کے من پسند رشتہ دار اس کے لالچ اور ہوس پرستی کی
کیوجہ سے اسکو دیکھنے سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ اسکی
اپنی باتیں اس کے لئے اجنبی ہو کے رہ گئی تھیں۔ اپنے خیالات تک

اُس کے اپنے نہیں رہے تھے ۔

صبح سویرے ہی اُس نے اپنی ڈائری دیکھی۔ نو بجے دکرم کلب کے ممبروں کی خصوصی میٹنگ میں شرکت کرنا تھی۔ گیارہ بجے مس فاطمہ کی بکواس سننا تھی ۔ ایک بجے اُس کے ایک دوست آ رہے تھے۔ تین بجے ایک اخبار کے لئے کالم لکھنا تھا۔ پانچ بجے کسی اور صاحب کے ساتھ فلم دیکھنا تھا۔ شام کو محلے کی ریفارم کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ یہ سب کام اُسے آج کے دن اُن کاموں کے علاوہ کرنے تھے۔ جو معمول میں داخل تھے۔ ڈائری دیکھ کر ہی خون خشک ہو گیا۔ مگر کیا کرتا ۔

آٹھ بجے تیار ہو رہا تھا۔ کہ ایک بزرگ رشتہ دار تشریف لائے۔ اب نہ اُن کو چھوڑتے بنتی تھی۔ اور نہ ہی دکرم کلب کا خیال ذہن سے نکلتا تھا۔ عجیب بے چینی کا عالم تھا۔ اُس بزرگ کی باتیں سُن رہا تھا۔ اور ہوں، ہاں کر کے اپنی سعادتمندی کا ثبوت دئیے جا رہا تھا۔ ایک نظر گھڑی کی طرف اور ایک اُن کی طرف۔ ایک ایک منٹ گزرتا تھا۔ اور اختر کی خوش اخلاقی اُس کی پریشانی میں اضافہ کرتی جاتی تھی۔ اُن بزرگ کیا کہتے تھے۔ اختر کو معلوم نہیں۔ اُنکی تقریر

اور رفتار وقت کی اس رسہ کشی میں صرف کریم کلب ذہن میں رہ گیا اور میٹنگ کا مقصد ذہن سے اتر گیا۔ یہاں تک کہ اپنے مشورے تک، جو میٹنگ میں پیش کرنے تھے۔ ایک معمولی خواب کی طرح ذہن سے مٹتے جا رہے تھے۔ خدا خدا کر کے وہ صاحب چلنے پر تو تیار ہو گئے۔ مگر اٹھتے ہوئے شام کو پھر آنے کا زبردستی کا وعدہ کر گئے۔ یہ یکطرفہ وعدے بھی بڑے مزیدار ہوتے ہیں۔

اختر کو کیا معلوم تھا۔ کہ کیا کہہ گئے ہیں۔ وہ تو انکے رخصت ہونے سے اتنا خوش ہو رہا تھا۔ کہ کوئی دستاویز اگر پیش کرتے تو اس پر بھی دستخط کر دیتا۔

اختر دکریم کلب کی طرف چل پڑا۔ سارا راستہ اس نے بے چینی میں کاٹا ٹیکسی میں بیٹھکر بھی اسے کبھی یہ خیال آتا۔ کہ ٹانگے والے کو چابک استعمال کرنا چاہیئے۔ وہ تو شکر ہے۔ کہ سوچ کے ہی رہ گیا۔ اگر ڈرائیور سے ایسا کرنے کے لئے کہا ہوتا۔ تو نہ جانے کیا ہوتا۔ کلب کے آفس میں داخل ہوا۔ تو نو بجکر پندرہ منٹ ہو گئے تھے۔ وہاں ان ممبروں کے سوا کوئی نظر نہ آیا۔ جو کسی وجہ سے

ان دنوں وہیں رہتے تھے۔ اختر کا دماغ قلابازیاں کھانے لگا۔ کبھی اپنے آپ پر غصّہ آتا۔ تو کبھی کلب کے ممبروں پر جو غیر حاضر تھے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے (جوزف) ایک ممبر سے پوچھا۔

"کیوں بھائی باقی لوگ کہاں ہیں؟"

جوزف نے جواب دیا "بھئی صبح کا وقت ہے۔ بیٹھو تو سہی"

اختر نے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

"پھر کیا ہم ہی بیکار ہیں۔ خیر تم تو کلب کے ستون ہو کے رہ گئے ہو۔ تمہارا ہلنا مشکل ہے۔ مگر۔"

جوزف نے کہا۔ "ارے تمہیں صبح صبح کیا ہو گیا ہے؟ شام کو میٹنگ میں اس بات کو دہرانا۔ مجھ غریب کو کیوں پکڑا۔ آؤ۔ بیٹھو"۔

اختر کے کانوں میں جوں ہی یہ آواز پڑی اسے کچھ یاد آنے لگا کہ یہ میٹنگ تو صبح کے بدلے شام کو رکھی گئی تھی۔ اپنی لاپرواہی پر غصہ آنے لگا۔ اگر یہ میز کے دراز کی طرح اس کے جسم سے باہر آنیوالی کوئی شے ہوتی۔ تو اس کا ہاتھ اس پر ضرور چلتا۔ بلا سے وہ خود ہی

زخمی کیوں نہ ہوتا۔

جوزف نے گرم گرم کافی کے ایک کپ سے اختر کے دماغ کو ٹھنڈا کر دیا۔ اور وہ کوئی ساڑھے دس بجے وہاں سے واپس ہوا راستے میں اُسے مس فاطمہ سے ملنا تھا۔ جس نے زبردستی اس سے وعدہ لے لیا تھا۔ بہر حال وہ اُس کے گھر پہنچا۔ نوکر سے پتہ چلا۔ کہ مس فاطمہ غسل خانے میں ہیں۔ گھڑی میں گیارہ بجکر تین منٹ ہو گئے تھے۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اور مس فاطمہ کے انتظار میں صبح سے اب تک کی پریشانی میں اور پریشان ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورے بارہ بجے مس صاحبہ کا نوکر چائے لیکر آ گیا۔ چائے کی طرف دیکھتے ہوئے اختر نے کہا۔

"کیوں بھائی! مس صاحبہ کے گیارہ کب بجتے ہیں"!

نوکر نے سلام کرتے ہوئے جواب دیا۔ "جناب کیا بتائیں۔ میرے خیال میں بارہ کے بعد ہی بجتے ہونگے۔ میں نے تو آج تک انہیں کبھی بارہ سے پہلے گھڑی دیکھتے نہیں دیکھا"!

اختر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس طرح قبل از دوپہر کے کام بھی

بغیر کسی ذکر کے انجام پاتے ہونگے۔"

اسی وقت دروازے میں مس فاطمہ نمودار ہوئیں قاعدے کے مطابق تو انہیں اختر کا استقبال کرنا تھا۔ مگر یہاں الٹا ہو گیا۔ اختر کو ہی اس کا خیر مقدم کرنا پڑا۔ اور اگر حقیقت دیکھی جائے تو اختر کو ان کے آجانے سے زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ پندرہ منٹ تک چائے کا دور چلا۔ اور بات کچھ بھی نہ ہو سکی۔ اختر وقفے وقفے سے ذہنی طور اس ماحول سے نکلکر صبح سے اب تک کے وقت کے نشانات ڈھونڈھنے لگتا۔ جو کہیں کسی ٹھوس کام کی صورت میں اُبھر کے سامنے نہیں آرہے تھے۔ باتوں کے دوران مس فاطمہ نے نوکر سے گھڑی لانے کو کہا۔ اس نے گھڑی لا کے دی۔ اور اسس کو دیکھتے ہی تعجب خیز انداز میں فرمایا۔

"مائی گاڈ۔ سوا بارہ ہو گئے ہیں۔ آپ کس وقت تشریف لائے تھے؟

"اختر۔ ایک بجے۔"

"مس فاطمہ۔ آپ مذاق کے موڈ میں ہیں۔"

"اختر۔ نہیں تو۔ آجکل گھڑیاں اُلٹی چلتی ہیں۔ رات کے

نو صبح کو اور صبح کے رات کو بجتے ہیں۔ اب دیکھئے نا ایک بجے سے
اب سوا بارہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر میں گیارہ ہو جائیں گے۔ میں آپ سے
مل لونگا۔ اور چلا جاؤنگا۔

مس فاطمہ۔ آپ نے کھانا بھی نہیں کھایا ہو گا۔ میں کھانا منگواتی
ہوں۔ ارے صابر۔

اختر۔ (بات کاٹ کر) میں تو کھانا پورے دو بجے کھاتا ہوں۔
اس کے بعد نہیں۔

مس فاطمہ۔ "اچھا پھر تو ابھی وقت ہے۔ دو بجنے ہیں"
اختر۔ نہیں تو میں یہاں آنے سے قبل ہی کھا چکا ہوں۔ پورے
دو بجے"۔

مس فاطمہ۔ "اختر صاحب! آج تو آپ بالکل فلسفی ہو گئے ہیں۔
چلو اچھا ہوا۔ لوگ عقل سے بھاگتے نظر آرہے ہیں"۔

تھوڑی دیر میں اختر وہاں سے رخصت ہو کے باہر آیا۔ اس وقت
ڈیڑھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ سڑک پر آ کر بس کے انتظار میں کھڑا
ہو گیا۔ تاکہ پیسے بھی بچ جائیں۔ اور گھر سے کھانا بھی کھا لے۔ مگر بس

نہیں آئی۔ بار بار گھڑی دیکھتا۔ مگر اس سے کیا ہوتا۔ آخر پورے بیس منٹ کے انتظار کے بعد بس آئی۔ اور وہ سوار ہوا۔ رہ رہ کے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ کبھی گھڑی کی سوئیوں پر شک کرتا۔ مگر حقیقت اس کے سامنے تھی۔

اختر گھر کے اندر داخل ہوا۔ تو پتہ چلا کہ اسلم آگیا ہے۔ یوں تو اُسے دیکھ کر وہ ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ مگر آج کی بات اور تھی۔ اس کے ساتھ کھانا کھایا۔ باتیں کیں۔ مگر رسمی انداز میں وہ دل کی خوشی جیسے سب گھڑی کی سوئیوں میں آگئی تھی۔ جن کو بار بار اختر دیکھتا تھا۔

تین بجکر چالیس منٹ پر اختر نے قلم اُٹھایا۔ مگر لکھتا کیا خاک۔ اُسے تو کاغذ میں بھی ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی نظر آرہی تھی۔ کسی نہ کسی طرح ایک کالم کو پُر کرنے کے لئے مواد تیار کیا۔ اور نوکر کو بلا کر اخبار کے دفتر بھجوادیا۔ اب اُسے کسی قدر سکون سا محسوس ہو رہا تھا۔ کہ کچھ تو ہوا۔ مگر یہ سکون عارضی ثابت ہوا۔

جونہی گھڑی کی طرف دیکھا۔ تو سوا پانچ ہو گئے تھے۔ جلدی سے گھر سے نکلا۔ اور بے خیالی میں ہی سینما گھر پہنچا۔ اُسے اس بات کا بھی

دھیان نہیں رہا۔ کہ حمید سے ماڈرن ہوٹل میں ملنا تھا۔ جہاں سے وہ ساتھ سینما جا رہے تھے۔ یہاں پہنچ کے اُسے یہ خیال آیا۔ تو پھر پریشانی نے گھیرا۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ وہ آیا ہوگا۔ اب انٹرول کے وقت ملے گا ٹکٹ لیکر جو اندر چلا گیا۔ تو وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ فلم نہ جانے کب شروع ہو چکا تھا۔ بڑی مشکل سے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے ایک سیٹ پر بیٹھا۔ اور ذہنی اضطراب کے اس عالم میں کبھی کبھی جو پردے کی تصویروں کی طرف توجہ ہوتی۔ تو پہلو بدلکر سمجھنے کی کوشش کرتا۔ مگر یہ ایک جاسوسی فلم تھا کیونکر سمجھ لیتا ع اُسکو بھی ہم نے دیکھا پہلو بدل بدل کے۔

کے مصداق انٹرول تک بیٹھا رہا۔ حمید کو ڈھونڈا۔ وہ کہاں ملتا۔ وہاں سے واپس آیا۔ تو اپنے آپ کو کوس رہا تھا۔ کہ گیا ہی کیوں مفت میں ٹکٹ کے چار روپے بھی ہاتھ سے گئے ؏

گھر پہنچا۔ تو سات بج چکے تھے۔ چائے کیلئے کہدیا۔ تو پھر گھڑی اور وقت میں کھو گئے۔ یہاں تک کہ چائے آگئی۔ اُسے یہ بھی خیال نہیں رہا۔ کہ چائے پی لی یا نہیں۔ وہ تو جب ہوش میں آیا۔ جب نوکر کہہ رہا تھا۔ "صاحب! حمید صاحب آئے تھے۔ اور جب اُنہیں

پتہ چلا۔ کہ آپ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ تو ناراض ہو کے چلے گئے اختر کی پریشانی میں قدرے اور اضافہ ہو گیا۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہو گئی۔ نوکر نے باہر جا کر پتہ کیا۔ تو محلے کی ریفارم کمیٹی کے کوئی ایلچی تشریف لائے تھے۔ اختر کو پتہ چلا۔ تو ناچار اٹھنا پڑا۔ ان کے ساتھ ہو لیئے۔ میٹنگ کیا تھی۔ بس سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے۔ کسی ایک نقطے پر متفق ہونا تو دور کی بات تھی۔ اصل مقصد ہی سامنے نہیں آرہا تھا سوا نو بجے برخاست ہو گئی۔ تو اختر کو کلب کا خیال تھا۔ دوڑے دوڑے وہاں پہنچے۔ دن بھر کی جھنجھلاہٹ اس پر پہلے ہی سوار تھی۔ اور پر جوزف نے صبح کی خبر وہاں پھیلا دی تھی۔ اختر کو سبوں کی ہنسی سہہ لینا پڑی ۵

واپسی پر بھی اختر اپنی گھڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کو وقت کا احساس اتنا نہیں ستا رہا تھا۔ پھر بھی گھڑی کو شک کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ معاً اسے یہ محسوس ہوا۔ کہ سارے فتنے کی جڑ یہی گھڑی ہے۔ جو رہ رہ کے وقت کا احساس دلاتی رہی ہے۔ اختر نے تو غصے میں اگر کئی دفعہ اسے کھول کے پھینک بھی دینا چاہا۔ مگر ابھی شاید

فرسٹریشن اتنی نہیں آئی تھی۔ آگے بڑھا تو اُسے خیال آیا۔ کہ دو بجے احساس ہے کیونکر بھاگا جا سکتا ہے۔ سورج کی روشنی، رات کا بدلنا کلنڈر کے اوراق، دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار جسم کا بڑھنا اور بوڑھا ہونا ان سب کو تو ایکدم نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بہتر یہ ہے۔ کہ اپنے آپ میں ہی اتنی لچک پیدا کی جائے۔ کہ یہ احساس پریشان نہ کرے۔ یہی ادھیڑبن میں اختر گھر پہنچ گیا۔ عادتاً اس نے اپنی کلائی کی طرف دیکھا۔ تو گھڑی اپنی اسی آواز سے اُسے دن کے بیکار گذرنے کا احساس دلا رہی تھی۔ اور اندر صبح والے بزرگ کی باتیں اُن کے کان کھانے کیلئے فضا میں گونج رہی تھیں۔

# شیریں کے خطوط

مرزا محمد زمان آزردہ کے انشائیوں کا مجموعہ جس میں خواتین کی ذکاوتِ حس، نزاکتِ خیال اور ذمہ داری کے احساس کو مختلف صورتوں میں پیش کیا گیا ہے۔

اس مجموعے کو مصنف نے اُن لڑکیوں کے نام معنون کیا ہے جو خطوط میں بھی اپنے خطوط ظاہر نہیں کرتیں۔

خوبصورت اور مضبوط جلد، کتابت و طباعت عمدہ

صفحات ۱۶۸ - قیمت صرف سات روپے اسی پیسے

# شامِ غم

شفق کی سرخی مغرب میں پھیلی ہوئی ہے۔ دور کہیں بادل کے آوارہ ٹکڑے اپنی دھن میں مست ہاتھیوں کے سے پیکر بنے ہوئے اپنے سفر میں مگن ہیں۔ خنک ہوا کے تھپیڑے انسانوں کے چہروں سے ٹکرا کر ان کے دلوں میں سکون و اطمینان کی لہریں پیدا کر رہے ہیں۔ انسان ایسے وقت میں دن بھر کی پریشانیوں اور معاشی تگ و دو سے فراغت پا کر فرحاں نظر آتے ہیں۔ سورج اپنا آج کا سفر ختم کر رہا ہے اور رات آج کا جنم لینے کو دن کے اُجالے سے ٹکرا رہی ہے۔ کتنا سہانا منظر ہے۔ مگر آہ! شام کے اس وقت کی تمام رنگینیاں اور رعنائیاں صرف دلِ انسان کی بدولت ہیں۔ انسان کے قلب و نظر ملا کر جس چیز کو جو چاہیں بنا سکتے ہیں۔ اور جب انسان کے دل کے شیشے میں بال آتا ہے۔ نظروں پر غم کا پردہ چھا جاتا ہے۔ اور خیالات غم و اندوہ میں ڈوب جاتے ہیں۔ تو سب کچھ پھیکا پڑ جاتا ہے۔

آج کی شام کو سب ایک ہی نظر سے نہیں دیکھتے۔ راشدہ کی زندگی
میں ایسی کتنی ہی شامیں آئی ہیں۔ مگر آج کی شام۔ اس کے لئے اپنے اندر
رنج و الم کی ایسی گھٹائیں لئے ہوئے ہے۔ جو اس کی پیاس بجھانے کی
بجائے اسے زیادہ دیتی ہے۔ دریچے پر بیٹھی نرم و نازک ہتھیلی پر رکھے ہوئے
وہ حسرت و یاس کی ایسی تصویر بنی ہے۔ کہ اگر انسان غور سے نہ دیکھے۔ تو
آذر کے ایک بت کا دھوکا ہو گا۔ مانی و بہزاد بھی اس کا عکس قلم سے نہیں دکھا
سکتے۔ ہاں صرف ایک محبت کرنیوالا دل ہی اس کے چہرے پر ٹوٹے ہوئے
خوابوں کے نقوش پڑھ سکتا ہے۔ تھوڑی دیر پہلے تک تو اس کے چہرے پر
کئی رنگ نظر آ رہے تھے۔ مگر اب وہ سب ایک ہی رنگ میں اس طرح مل گئے ہیں کہ
ان کو پہچاننا بھی مشکل ہے۔ اب صرف مایوسی کا رنگ ہے جس میں کہیں بھی
امید کی کرن تک نہیں جھلکتی۔ مایوسی انسان کی زندگی کو بے نور کر دیتی ہے۔
امید ہی ایک ایسی شے ہے جس سے تصویر حیات زندہ لگتی ہے۔ اور جب
ایسے انسان سے یہ روح بھی چھن جائے۔ جس کے پاس امیدوں کی اس زندگی کے
بغیر کچھ بھی نہ ہو۔ تو اس کا جینا نہ جینا ایک بات ہے۔ اوروں کے لیے تو زندہ
نظر آتا ہے۔ مگر اپنے لئے۔ اپنے لئے وہ مردہ ہوتا ہے۔ اس دنیا سے دور

بہت دور جہاں کوئی اس کا ساتھی نہیں ہوتا۔

راشدہ کے جوانی کے خطوط بابو جی کے لبادے میں چھپ گئے۔ سامنے اختر کا خط ہے۔ جو اس نے آخری خط بھیجا تھا۔ اب قسمت اس کو دو بار لے گئی تھی۔ جہاں ڈاک کا سلسلہ ختم ہوتا ہے۔ صرف روحوں کا تعلق باقی رہتا ہے۔ راشدہ نے سر ہتھیلی پہ رکھے ہی اپنے دوسرے ہاتھ کی نازک انگلیوں سے خط کھولا۔ اس کے سامنے اختر کی تحریر تھی۔

"راشدہ ڈیر۔

خدا تمہیں سلامت رکھے۔ تمہارا خیال مجھے اس بستر پہ زندہ رکھے ہوئے ہے۔ کاش تم میرے سامنے ہوتیں۔ زندگی کے جتنے دن باقی ہیں۔ آرام سے گزرتے۔ میں تمہیں کچھ بھی نہ دے سکا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا۔ کہ میں ایسی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا۔ تو تمہارے راستے میں کبھی نہ آتا۔ ڈاکٹر لوگ مجھے تسلی دیتے ہیں۔ کہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میں چراغ سحری ہوں۔ میری شمع زندگی کی لو تھرتھرا رہی ہے۔ معمولی ہوا کا جھونکا بھی اسے بجھا سکتا ہے۔ تمہارا خیال اب تک اس طوفان کو روکے ہوئے ہے۔ مگر موت کے سامنے کوئی کب تک ڈھال بن سکتا ہے نہ جانے

تمہارا یہ انتظار اور گھر ٹوٹنے کے گرداب بننے کا منتظر ہے۔ مگر راشدہ۔
راشدہ! میں چین سے نہیں مر سکتا۔ کاش میں اس لائق ہوتا۔ کہ تمہیں تسلی
دے سکتا۔ دنیا یہی ہے۔ کوئی کب تک کسی کا ساتھ دے سکتا ہے۔ ہر ایک کا وقت
مقرر ہوتا ہے۔ ہر شخص ایک سٹیج ایکٹر کی طرح سٹیج پر آکر اپنا پارٹ
ادا کرتا ہے۔ اور چلا جاتا ہے۔ صرف اتنا فرق ہے۔ کہ سٹیج ایکٹر کو اپنی
ایکٹنگ کے بارے میں علم ہوتا ہے۔ کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اور کتنے وقت تک
سٹیج پر رہنا ہے۔ مگر ہم اس سے بے خبر ہیں۔ راشدہ مجھے یہ ایک ڈرامہ
تھا۔ جو میں نے تم سے کھیلا۔ ہم دونوں ایک ڈرامے میں ملے تھے۔ پردہ گر گیا
اور اپنے اپنے راستوں پر چلے گئے۔ میں جانتا ہوں۔ تم اپنے گھر کے بندھن
توڑ کر میرے پاس اس وقت نہیں آسکتیں یہی ٹھیک ہے۔ تاکہ میں دور سے
تمہیں اپنی حالت سے آگاہ کر دوں۔ تم اپنی زندگی کو خوشیوں سے بھر
دینا۔ واللہ میں مر کر بھی تمہاری وجہ سے چین نہ پاؤں گا۔ مجھے اپنے
ہاتھ سے ایک خط لکھ دو۔ کہ تم اپنے دل کو میرا ماتم کدہ بنانے کے بجائے
کسی اچھے آدمی کا چشمہ محبت بناؤ گی۔ جس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوں گے
میری تم سے یہی التجا ہے۔ جو تم کو دھوکے میں نہیں رکھنا نہیں لکھنا چاہتا تھا

دنیا کی ریت ہے کہ مرنے والوں کے ساتھ مرا نہیں کرتے۔ میرا قلم جواب دے چکا ہے۔ میں تھک گیا ہوں۔ تم نے جس اختر کو اپنی امیدوں کے آسمانوں پہ سجا کے رکھا تھا۔ وہ اب چھپنے کو ہے۔ صرف تمہارے قلم کے اشارے کا منتظر ہے۔ بس ایک بار خط لکھ دو۔ صرف ایک بار۔

"تمہارا اختر"

راشدہ کے سامنے وہ تحریر بھی گھوم رہی تھی۔ جو اس نے جواب میں لکھی تھی جس میں اس نے اختر سے کہا تھا۔ محبت زندگی یا موت سے نہیں ہوتی۔ مرنا جینا محبت میں شرط ہی نہیں۔ یہ تو وہ جنون کا سودا ہے۔ اس کی دوکان عمر میں ایک بار لگائی جاتی ہے۔ اور گاہک صرف ایک بار آتا ہے۔ بس ایک بار ـــــ میری ہر خوشی اور میرا ہر شوق میرے لیے صرف اختر کا غم ہے

اے زندگی کے شوق کا عنوان ہی رہا ہے    رکھا ہے غم کا نام مسرت تیرے لئے

انشاء اللہ تم ضرور صحت مند ہو جاؤ گے۔ انشاء اللہ کی دعا میری بے اثر نہیں ہو سکتیں۔ ہم پھر اسی دنیا میں چلے آئیں گے۔ جو مرض نے بے رحم ہاتھوں نے چند دن کیلئے ہم سے چھین لیا ہے۔

مگر آج جب اُسے خبر ملی۔ کہ اختر کو موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے

ہمیشہ کے لیے [illegible] تو اُس کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی - وہ
بے چین ہو گئی - لیکن تھوڑی دیر کے بعد ہی اُس کی - بے چینی ختم
ہو گئی - اور اُس کے چہرے کے خطوط آج کی شام غم کے رنگ یا مایوسی میں
ایسے ڈھل گئے - کہ آسمان پر بچھی ہوئی اختروں کی انجمن بھی انکو نہیں
اُبھار سکی -

# سلسلۂ تارِ نگاہ

سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ارشد نے کچھ توقف کے بعد اپنی تقریر پھر جاری رکھی۔

"معزز سامعین میں عرض کر رہا ہوں۔ کہ افسانہ نویسوں اور ڈرامہ نگاروں کی ہر بات عام ڈگر سے ہٹ کر ہوتی ہے۔ اُن کا بس چلے۔ تو ہر بات کو مکالمہ بنا کے چھوڑ دیں۔ اکثر افسانہ نویسوں اور ڈرامہ نگاروں کی بیویاں چوتک پڑتی ہیں۔ جب وہ انہیں اپنے افسانے یا ڈرامہ کی ہیروئن تصور کرنے لگتے ہیں۔ اگر وہ خواتین ہوئیں۔ تو اُن کے شوہر بھی اِدھر اُدھر اس موڑ پہ آکر بوکھلا جاتے ہیں۔ اور جو اتفاقاً کبھی دونوں میاں بیوی اسی قبیل سے ہوئے۔ تو وہ گھر ہی ساری عمر ایک سٹیج یا افسانہ بنا رہتا ہے۔ اور اُن کے بچے اور رشتہ دار افسانے یا ڈرامے کے سپورٹنگ یا ڈیولپنگ کیریکٹر نظر آتے ہیں۔"

تالیوں کی آواز پھر آئی۔

ارشد تھوڑی دیر رُک جانے کے بعد بولنے لگا۔

"خواتین و حضرات، یہی حال اُن کے خطوط کا بھی ہوتا ہے۔
اُن کے نجی خطوط میں بھی یہی رنگ نظر آتا ہے۔ اِس کی وجہ ظاہر ہے
کہ انہیں اکثر فرضی خطوط لکھنے پڑتے ہیں۔ کبھی شیریں کے خطوط
لکھتے ہیں۔ تو شیریں الفاظ میں ایک مرقعۂ دلفریب کھینچ کے رکھ دیتے
ہیں۔ کبھی فرہاد کے خطوط لکھتے ہیں۔ تو تیشہ بدست ہونے کی بجائے
تیشہ بکف نظر آتے ہیں۔ لیلےٰ کے خطوط لکھتے ہیں۔ تو محمل نشین نظر
آتے ہیں۔ مجنوں کے خطوط لکھتے ہیں۔ تو صفحۂ قرطاس پر تمام ریگ
صحرا کو ایسے بکھیر دیتے ہیں۔ کہ مجنوں بھی ہاتھ ملتا دہیں تک پہنچ جاتا ہے۔
غرض اِن کے خطوط کا بھی کوئی ٹھکانا نہیں۔ کچھ منحنی ہوتے ہیں۔
تو کچھ قوسین کی صورت میں کہیں متوازی خطوط کھینچ دیتے ہیں۔
جو قیامت تک بڑھتے جائیں۔ تو ملیں گے نہیں۔ ایسے موقعوں پہ
غالب یاد آتے ہیں۔ ع کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

ایک بار پھر تالی بجتی ہے۔

ارشد اپنی تقریر پھر شروع کرتا ہے

"معزز سامعین کہیں وہ خطوطِ غم کھینچ کے رکھدیتے ہیں۔ تو کہیں خطوطِ حسن کی ناقابلِ فہم اور ناقابلِ تشریح علامتیں نظر آتے ہیں۔ معزز سامعین مجھے بہت افسوس رہا ہے۔ کہ وقت کی کمی نے مجھے آپکا کافی وقت ضائع کرنے پر مجبور کیا۔

ہال سے ہنسنے کے ساتھ ساتھ کئی آوازیں آئیں۔

"آپ بولتے رہئے۔ آپ کے لئے وقت کی کوئی قید نہیں۔ آپ آپ . . .

ارشد نے آگے کہا۔

ایکدفعہ برنارڈ شا اپنے ایک دوست کو خط لکھ رہے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ ایک ڈرامہ نویس کا خط مختصر ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں ایک بات ہے۔ کہ انہیں اکثر اس کا احساس نہیں ہوتا۔ لیکن شا کو خود بھی یہ خط الف لیلہ کی داستان لگا۔ اس لئے آخر میں دوست کو لکھدیا۔ کہ ایک طویل خط لکھ رہا ہوں۔ میں مختصر خط لکھدیتا۔ مگر میرے پاس وقت نہیں تھا۔ اس طرح میں بھی ہمت کی کمی کا شکار ہو گیا۔ امید ہے۔ آپ

میری پچھلی کوتاہی کو بھی معاف فرمائیں گے۔ اور مزید کچھ عرض کرنے کی زحمت بھی نہیں دیں گے۔ آداب۔"

ہال تالیوں سے ایک بار پھر گونج اٹھا۔ ارشد ڈائس سے اتر رہا تھا۔ تو کئی طلبا اس سے مصافحہ کرنے آگے بڑھے سیکریٹری کی آواز فضا میں گونجی، "محترم صدر صاحب اب اپنے خطبۂ صدارت سے سامعین کو نوازیں گے۔ اور اس کے ساتھ ہی جلسہ کی کارروائی اختتام پذیر ہو گی۔"

ڈاکٹر امین الزماں نے محسوس کیا۔ کہ سامعین کی توجہ حاصل کرنا مشکل ہے۔ جہاندیدہ بزرگ تھے۔ ارشد کے نام سے ہی اپنی تقریر شروع کی اور ارشد کی تعریف کے ہی پردے میں صدارت بخشے جانے کا شکریہ بھی ادا کر دیا۔ اور اپنی بات بھی نبھائی۔ جو بات ارشد تجربہ کم ہونے کی وجہ سے مکمل نہیں کر سکا تھا۔ ان کو بھی اسے پورا کرنے کا موقع نہیں ملا۔ جلسہ ختم ہو گیا۔ سب ارشد کو ڈھونڈ رہے تھے۔ اکرم نے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"بھئی واللہ کمال کر دیا آج"

سلمیٰ آئی۔

"ارشد بھائی آج طبیعت خوش کردی۔ اب کے یونین کے الیکشن میں کھڑے ہو جایئے۔ لڑکیوں کے سب ووٹ آپ کے نام"۔

ارشد نے جواب میں صرف مسکرا دیا۔

حمید دوڑتا ہوا آیا۔ اور ارشد کو گلے لگا کر کہنے لگا۔۔

"ارشد بھائی۔ مجھے معلوم تھا۔ آپ صرف شاعری ہی کرتے ہیں مگر چھپے رستم نکلے"۔

ارشد ایک کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلد بائل ہاؤس کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیا۔ اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ طلبا تبصرہ کرتے ہوئے ٹیلی ویژن پر نظر آنے والی مدھم مگر متحرک تصاویر کی طرح بکھرتے نظر آرہے تھے۔ ارشد آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ کہ سوئمنگ پول کی دیوار کے پاس اسکو ایک سایہ نظر آگیا اسنے خیال کیا۔ کہ فلسفے کا کوئی ریسرچ سکالر رات کی تاریکی میں دن کا اجالا تلاش کر رہا ہوگا۔ کہ یہ سر شام کہاں چلا جاتا ہے۔ اس لئے آگے بڑھا۔

وہ سایہ کے پاس سے گذرنے ہی والا تھا۔ کہ اُسکے کانوں میں ایک سریلی آواز پڑی۔

"ارشد صاحب"۔ ارشد ٹھٹھک گیا۔ کہ کہیں اُسی کو تو دن کا اُجالا سمجھ کر تختۂ تحقیق تو نہیں بنایا جا رہا ہے۔ مگر آواز سریلی تھی۔ اس لئے جلدی ہی اپنی سوچ کی صحت کا خیال کر کے وہ سائے کی طرف لپکا اور پوچھا۔

"کون"

"میں ہوں غزالہ" وہاں سے جواب ملا۔

ارشد اب سمجھ گیا۔ کہ یہ اُس کی کلاس فیلو ہے۔ غزالہ بہت ہی حسین لڑکی تھی۔ کلاس میں کم بولتی تھی۔ اور اکثر سیمنار لائبریری میں بھی خاموش ہی رہتی۔ ارشد کو کبھی اس کے ساتھ بات چیت کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ اگرچہ کلاس میں وہ کبھی کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ ہی لیتا تھا۔ لیکن اتنا اندازہ ارشد کو ہو گیا تھا۔ کہ وہ پڑھتی کم اور سوچتی زیادہ ہے اس وقت ارشد کے ذہن میں وہی کلاس کے سین آرہے تھے۔ کہ

ان کا سلسلہ غزالہ کی آواز نے توڑ دیا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

"آپ کی تقریر سب کو پسند آ گئی۔ میری طرف سے مبارکباد قبول کیجئے۔" ارشد نے جواب دیا۔

"میری تقریر میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہاں سامعین کی مہربانی سے چل گئی۔ اگر وہ تعریف نہ کرتے۔ تو میں کیا کرتا۔ ظاہر ہے۔ نہ تو اپنی تقریر واپس لے سکتا تھا۔ اور نہ ہی اس سے عمدہ تقریر کر سکتا تھا۔"

غزالہ نے کہا۔ ع

صداقت خود بخود کرتی ہے شہرت ہر زمانے میں

ارشد کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ اور چونکتے ہوئے بولا۔

"مگر آپ اس وقت یہاں کیا کر رہی ہیں۔ چلئے میں آپ کے ساتھ گرلز ہوسٹل تک آتا ہوں۔"

غزالہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے قدم بڑھایا۔ اور ارشد اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ کہ ارشد نے پوچھا۔ "کیا ان میں آپ بھی شامل ہیں۔ جنہیں میری تقریر پسند آئی؟"

غزالہ نے شوخی کے انداز میں کہا۔
"اگر میں ناں کہوں تو!"
ارشد جھینپ سا گیا۔ مگر گھبراہٹ کے باوجود اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا۔
"تو میں یہ سمجھونگا۔ کہ آپ واقعی صحیح الذہن ہیں"۔
"آپکا مطلب یہ ہے۔ کہ ڈاکٹر امین الزمان بیوقوف ہیں۔ جو آپکی اتنی تعریف کی۔ بیچارے کی بولتی بند ہو گئی تھی۔ جو آپکا نام باربار نہ دُہراتے"!۔

غزالہ نے یہ الفاظ بہت ہی نرم لہجے میں دُہرائے۔
ارشد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اتنی دیر میں گرلز ہوسٹل نزدیک آگیا۔ غزالہ نے ایک بار پھر ارشد کا شکریہ ادا کیا۔ اور وہ شب بخیر کہکر واپس ہوا۔۔

دوسرے دن سے ارشد کے لئے ڈیپارٹمنٹ میں فرصت کا ایک لمحہ بھی عنقا ہو گیا۔ اُس کے دوست اُسے اکیلا کبھی نہ چھوڑتے۔ کوئی پان کھلا رہا ہے۔ کوئی اپنی باتوں سے اس کی جان کھا رہا ہے۔ غرض اُسکو

ایک منٹ کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ غزالہ کی بھی ابتک نئی دو تین سہیلیاں بن
گئی تھیں۔ وہ ہر وقت انکے گھیرے میں رہتی۔ غزالہ اور ارشد اکثر ملتے، مگر سلام
دعا سے آگے بات نہیں بڑھتی۔ دونوں ایکدوسرے کا خیر مقدم مسکراہٹ سے
کرتے۔ مگر پاس بیٹھنے کا موقعہ نہ ملتا۔ ملتا بھی کیسے، ہر روز جلسہ ہوتا ہی رہتا ہے
اور پھر مسلم یونیورسٹی کی اپنی روایتیں جو یہاں کے لوگوں کو اپنے دلوں سے
زیادہ عزیز تھیں کیسے نظرانداز کی جا سکتی تھیں۔

ارشد ہر وقت غزالہ کے خیالات میں کھویا رہتا۔ اسکی راتیں بے چینی سے
گذرتیں۔ وہ ہر وقت سوچتا رہتا۔ کہ کیسے غزالہ سے اپنے دل کی بات کہدے
کب کہے۔ کہاں کہے۔ ہر گھڑی اس پہ یہی دھن سوار رہتی۔ مگر اسکی نفاست اسے
دوسروں کے سامنے کچھ کہنے کی اجازت نہیں دیتی۔ رات کو وہ ہوسٹل میں سوچتا رہتا
کہ صبح وہ یوں گفتگو شروع کریگا۔ غزالہ کو اپنی تازہ غزل دیدیگا۔ جو اس نے اسی کے
تصور میں کہی تھی۔ مگر صبح ڈیپارٹمنٹ پہنچتے ہی وہی بات ہو جاتی۔ اور ویسے وہ
ہنس کھیل لیتا تھا۔ کچھ لڑکیوں پہ چوٹیں بھی کرتا تھا۔ فقرے بھی کستا تھا۔ لیکن
غزالہ سامنے آتی۔ تو وہ بغلیں جھانکنے لگتا۔ سلام دعا کے آگے وہ کچھ بھی نہ کہہ پاتا۔

دوسری طرف غزالہ کا بھی یہی حال تھا۔ وہ ہر رات دعا کرتی۔ کہ صبح ارشد
اس سے کچھ کہے۔ اور وہ ناز و ادا کے ساتھ اس کی بات کا اقرار کرے۔ عہد و

پیمان ہوں۔ مگر پھر دونوں دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے ہوتے ہوئے بھی جا کر مل نہ پاتے تھے۔ اور درمیاں میں لہروں کا طوفان یوں کا توں رہتا۔ کبھی کبھی غزالہ سوچتی کہ یہ یکطرفہ معاملہ ہے۔ مگر دل نہیں مانتا تھا۔ اکثر اُسے ارشد پر غصہ آتا۔ کہ اُس نے جلسے کی رات اس سے پیار بھری باتیں کیوں نہ کیں۔ لیکن پھر اپنے دل کو سمجھاتی۔ کہ پہلی ملاقات تھی۔ وہ اظہارِ محبت کرتا بھی کیسے؟۔ ادھر ارشد پچھتا رہا تھا۔ کہ اس نے رات کے اندھیرے میں اُس شام غزالہ سے کیوں نہ کہا۔ کہ . . . . . . آخر اسے کیا ہوا تھا۔ اُسے رہ رہ کے اپنے آپ پر غصہ آ رہا تھا۔ غزالہ نے اُس کو موقع دیا تھا۔ وہ خود موقعے کا فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ قسمت زندگی میں ایک بار اُس کے سامنے جگمگائی تھی۔ مگر وہ اُسے پکڑنے کی بجائے اُس کا نظارہ کرتا رہا۔ ارشد اب اپنی قسمت کا وہ مسکراتا ہوا چہرہ یاد کرتا تھا جس نے اُس کی رات کے اندھیرے کو دن کے اُجالے میں بدلنا چاہا تھا۔ مگر اب پچھتانا بیکار تھا۔

ارشد جب بی۔ اے میں پڑھتا تھا۔ تو اپنے ساتھیوں سے فخر سے کہتا کہ اس کے دل پر کبھی چوٹ نہیں لگی۔ تفخر آمیز لہجے میں اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ دیتا کہ میں (Realist) ہوں۔ محبت اور عشق تو جذبات کے کھیل ہیں جو خلل دماغ سے جنم پاتے ہیں۔ مگر اب جو دل پر ہاتھ رکھتا تو لگتا

ا۔ کہ سارا جہاں تھ پہ ہنس رہا ہے۔ اب دل پر قابو نہیں رہا۔ بلکہ خود بھی
اس کے قابو میں تھا۔

ارشد کا کمرہ ڈبل سیٹڈ تھا۔ اس لئے روم پارٹنر حامد کے ساتھ جلدی ہی دوستی
ہو گئی تھی۔ دونوں ایک ہی مہینہ قبل اس کمرے میں آ گئے تھے۔ حامد اوسط درجے
کا طالب علم تھا۔ مگر ارشد کے لئے غنیمت تھا۔ اس کو اپنا رازدار بنا لیا تھا۔
ابتدا میں حامد نے اپنی استعداد کے مطابق ارشد کو سمجھایا بھی۔ لیکن جب
اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو اس نے وہاں جہاں بات بنائے نہ بنتی۔ یہی رہا
تو وہ بھی سنجیدگی سے اس کو مشورے دینے لگا۔ اکثر کتابیں سامنے رکھکر
اس مسئلے کا حل تلاش کرنے لگتے۔ لیکن رات کے ہر پل کے بعد صبح کا عالم وہی ہوتا
دن گذرتے گئے۔ امتحان کا زمانہ قریب آ گیا۔ اب آزاد لائبریری
دس بجے رات تک کھلی رہتی۔ سیمنار تو اس کے بعد بند ہوتے۔ سٹوڈنٹ،
امتحان کی تیاری زور و شور سے کر رہے تھے۔ ارشد کے کمرے میں بھی بتی
رات بھر جلتی رہتی۔ مگر وہ کتابوں میں نہیں، غزالہ کے حسین تصور میں کھویا
رہتا۔ حامد پڑھائی کے زمانے میں یہ ڈسٹربنس برداشت نہ کر سکا۔ اس لئے
وہ کمرے سے باہر ہی پڑھا کرتا۔ وہ اکثر ساری رات ہوسٹل کے ریڈنگ
روم میں گذارتا۔ جانے کو تو ارشد بھی لائبریری جاتا۔ لیکن شباب کی

کتابوں کی تلاش میں نہیں۔ جو اُسے امتحان کے لیے پڑھنا تھیں۔ وہ تو اُس
کتاب کو ڈھونڈ رہا تھا۔ جو اُس کی رگ رگ میں بس گئی تھی۔ جس نے اُس کے
دل و دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ کتاب جب بھی ملتی تو اُس کی پہیلیاں
اُس کے ساتھ ہوتیں۔ اور پھر وہی بات ہوتی جس کا اُسے بارہا تجربہ ہو چکا تھا۔

امتحان میں سات دن باقی رہ گئے تھے۔ سکیم آؤٹ ہو چکی تھی۔ لڑکیوں کا
سینٹر گرلز کالج میں تھا۔ اور ارشد کا سنٹر بھی ہال میں۔ آج ارشد سنجیدگی سے
امتحان کے مسئلے پر غور کرنے لگا۔ اور اُس نے پڑھنے کا ارادہ کر لیا۔ ذہین تو تھا ہی
قسمت نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ کچھ ایسے سوالوں کا پڑھائی کیلئے انتخاب کیا
کہ دیا ہمیشہ فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ اب ارشد کچھ سنجیدہ نظر
آنے لگا تھا۔ اور غزالہ کی طرف بھی کم متوجہ ہوتا تھا۔ مگر کبھی کبھی ایسا ہو جاتا

ع وہ جب یاد آتے ہیں تو بے حد یاد آتے ہیں۔

حامد کے پرچے کچھ زیادہ اچھے نہیں ہوئے تھے۔ وہ مشکل سے سیکنڈ
ڈویژن میں پاس ہوا۔ ارشد کے رزلٹ نے اُس کے دل میں حسد پیدا کیا
مضامین تو دونوں کے مختلف تھے۔ مگر روم پارٹنر جو تھے۔ اس لئے حسد
کرنے کا موقع کوئی نہیں چھین سکتا تھا۔

زندگی کا بھیدی تو لنکا کو ہی ڈھا دیتا ہے۔ جو کام ارشد چھ مہینے میں نہیں

یا پایا تھا۔ وہی حامد نے فوراً ہی کر دکھایا۔ وہ ارشد کے ڈیپارٹمنٹ
میں بھی اب نظر آنے لگا تھا۔ نفسیات میں دلچسپی دکھا کر وہ ان کے
سیمنار میں بھی بیٹھتا۔ ارشد کو نیچا دکھانے کے لئے اُس نے ارشد کے
ہی کلاس فیلوز سے دوستی گانٹھ لی۔ اور رفتہ رفتہ وہ غزالہ کے
کانوں میں ارشد کے خلاف زہر گھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسے سٹوڈنٹ
خواہ مخواہ بھی حامد کے دوست بن گئے۔ جو اپنی ذہنی کمزوریوں کو
عقلمندوں کی دشمنی میں چھپانے کے کوشاں ہوتے ہیں۔

اب فرصت کے اوقات میں غزالہ کبھی کبھی حامد سے ملنے بھوپال
ہاؤس آجاتی۔ ارشد ایسے موقعوں پر آنکھیں چرانے کے سوا کیا کرتا۔
کبھی دونوں شمشاد مارکیٹ میں ساتھ نظر آجاتے۔ ایک دن ارشد نے
تصویر محل سے فلم دیکھ کر نکلتے دیکھا۔ یہ سب باتیں ارشد کے زخموں پر
نمک پاشی کا کام کرتی تھیں۔ غزالہ اب بھی اُسکی نظروں میں ایک معصوم
لڑکی تھی۔ مگر وہ حامد کے اشاروں پر کیوں ناچتی ہے۔ کیا جذبات کی رَو نے
اسے زندگی کی ان بھول بھلیوں میں پہنچا دیا ہے۔ کہ اُسے اپنی خبر نہیں۔ کیا
اسے ایک مرد کی تلاش تھی۔ اور ارشد کی نہیں۔ مختلف سوالات اسے پریشان کر رہے تھے
دوسری طرف ارشد کو بدنام کرنے کی کوشش بھی جاری تھی۔ جو لوگ

ان باتوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ ان کو بھی کیا پڑی تھی۔ کہ وہ ارشد کے بچاؤ کی کوشش کرتے۔ البتہ ڈاکٹر رفیع الزمان نے غزالہ کو ٹوکا۔ مگر وہ اس حد کو چھو چکی تھی۔ جہاں انسان اپنی ہر بات کو صحیح سمجھتا ہے۔ نفسیات کے سٹوڈنٹ، نفسیاتی امراض کے سب سے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔

ارشد ان سب باتوں سے بے خبر اپنی ہی قسمت کو کوس رہا تھا۔ کہ ایک دن سلمٰی نے اشاروں ہی اشاروں میں اسے حامد کی بات بتائی۔ شبیر نے بھی آکر ارشد سے یہی باتیں کیں۔ اور ان سب کا پول کھولنے پر زور دیا۔ اس نے تو ارشد کو بزدل بھی کہا۔ مگر ارشد کے دل میں غزالہ کیلئے اب بھی وہی جگہ تھی۔ اس نے شبیر کو روک دیا۔ اسے ڈر تھا۔ کہ اس کے دل کی ملکہ اسطرح بدنام ہو جائیگی اس نے اسوقت بھی شبیر کے سامنے غزالہ کی معصومیت کی تعریف کی۔ جس پر شبیر ناراض ہو کے چلا گیا۔

ارشد دل ہی دل میں کڑھتا۔ اسے وہ دن یاد آتے۔ جب غزالہ سے بات کرنیکا موقعہ نہیں ملتا تھا۔ اور اب نہ تو سہیلیاں پردے پر ہیں۔ نہ وہ نظروں کے حجاب بیچ میں حائل ہیں۔ اور نہ ہی شرم و حیا کے خیالات ارمانوں کو گھائل کرتے ہیں حامد اور غزالہ کھلے بندوں ایکدوسرے سے عشق کا کھیل کھیلتے ہیں۔ یہ نظارے اس کے لئے نظر سوز تھے مگر ع ستم ہے آدمی کیواسطے مجبور ہو جانا

بظاہر دونوں میں بے تعلق نظر آتا۔ مگر ہر کلی دل زخم خوردہ اور بھی زخمی ہو جاتا۔
وقت گزرتا گیا۔ دوسرا امتحان ہوا۔ گرمیوں کی تعطیلات کی وجہ سے گھروں کو جانیکی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ پروسٹ کے آفس میں کنسیشن فارموں پر دستخط کرانیوالوں کی بھیڑ تھی۔ ارشد پروسٹ کے آفس سے باہر آکر سوچنے لگا۔ کہ مجھے گھر جانا چاہیئے یا نہیں۔ پروسٹ کا دستخط کیا ہوا کنسیشن فارم اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ بے خیالی میں وہ رجسٹرار آفس کیطرف چلا گیا
تھوڑی دور چلنے کے بعد اسے غزالہ دکھائی دی۔ ارشد نے اسکی طرف دیکھا اور ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر آئی۔ غزالہ نے بھی اسکی طرف دیکھا۔ مگر اسکی آنکھیں خود بخود جھک گئیں۔ ارشد نے اپنے جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"کہئے! کوئی شکایت تو نہیں مجھ سے"
غزالہ جیسے اسی جملے کی منتظر تھی۔ اس نے جلدی جلدی کہا۔ "میرا خیال تھا آپ فرشتہ ہیں۔ مگر آپ کیا نکلے؟ یہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ میرا اندازہ کتنا غلط نکلا"۔ ارشد نے اطمینان سے جواب دیا
"انسان کے اندازے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ ممکن ہے۔ آپ اب بھی غلط سمجھ رہی ہوں"۔

غزالہ نے جذباتی انداز میں کہا۔
"اب کیا باقی رہ گیا ہے۔ جسکا اور انتظار ہو۔ حقیقت جب سامنے آجائے۔ تو آنکھوں پر شک کرنا بے وقوفوں کا کام ہے"۔

اس کے ساتھ ہی غزالہ نے وہ تمام باتیں بیان کر دیں۔ جو اس کے دل میں تھیں۔ اور ارشد ایک ایک کر کے ان کو غلط ثابت کرتا گیا۔

غزالہ کے چہرے سے تفکر اور اضطراب کے ملے جلے آثار جھلک رہے تھے۔ اور ارشد ایک منطقی کی طرح اس کے ذہن کی اور ہالنگ over-hauling کر کے اس سے غلط فہمیوں کی زنگ دور کر رہا تھا۔

یہ باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ کہ سامنے سے حامد آیا۔ اسکی نظر جونہی ان پر پڑی۔ اس نے غزالہ سے کہدیا۔

"ہلو غزالہ — خوب ملیں مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ میں کل گھر جا رہا ہوں۔ چلو پکچر دیکھنے چلیں"۔

غزالہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کی مٹھیاں خود بخود بند ہو گئیں اور سخت لہجے میں کہا۔

"مدت سے پردے کی تصویریں دیکھتی آئی ہوں۔ اصلی تصویر تو آج ہی سامنے آئی ہے۔ آپ جائیے۔ مجھے اب فرصت نہیں"۔

اتنا کہکر اس نے ارشد کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اسکو بھی اپنے ساتھ تیز تیز قدم اٹھانے پر مجبور کر دیا ——— غزالہ اور ارشد جا رہے تھے۔ اور حامد کھڑا دیکھتا رہا۔